اکتوبر ۲۰۲۶ء

پاک جمہوریت

وزارتِ اطلاعات ونشریات کا جریدہ

جلد :66 شمارہ :10

DIRECTORATE OF ELECTRONIC MEDIA AND PUBLICATIONS

PAKISTAN
INSTITUTE OF
MEDICAL SCIENCES
ISLAMABAD
انتہائی نگہداشت یونٹ ایم سی ایچ وچلڈرن ہسپتال
Intensive Care Unit
Emergency Entrance
داخلہ برائے ایمرجنسی
AMBULANCE
RESCUE 1122
HAKIM

اکتوبر ۲۰۲۶ء

پاک جمہوریت

وزارتِ اطلاعات ونشریات کا جریدہ

جلد: 66 شمارہ: 10

	اداریہ		۵
۱۔	صوبوں سے اٹھنے والی بازگشت زور پکڑ گئی بات ریفرنڈم تک جا پہنچی، پنجاب، سندھ اور ہزارہ صوبے کی تجاویز	امتیاز احمد تارڑ	۶
۲۔	بھارتی آبی جارحیت، ہٹ دھرمی اور پاکستانی موقف کی قانونی وسفارتی فتح	محمد زکریا	۱۳
۳۔	پاکستان کی معیشت توانائی بحران اور عوامی مسائل	رباب زہرا	۲۰
۴۔	یوم سیاہ کشمیر: پاکستان کی آواز، کشمیریوں کا عزم	ڈاکٹر محمد گلزار	۲۶
۵۔	سانحہ پر انتظامی اداروں کی نااہلی اور ناقص انتظامات	کنول افتخار	۳۴
۶۔	کرکٹ بحران مسلسل شکستیں اور تبدیلیاں	ناصر نقوی	۳۹

نگران اعلیٰ: عمرانہ وزیر
نگران: محمد سلیم
مینجنگ ایڈیٹر: شہپہ عباس

ایڈیٹر: مائرہ جاوید
ڈیزائنر: محمد وسیم

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز،
291۔اے، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور
انتظامیہ: 042-99333909
مدیر: 042-99333912
email:editor@pakjamhuriat.org

انتباہ

ادارے اور میگزین ''پاک جمہوریت'' کا مقصد عوام الناس کو آگاہ کرنا اور بہترین مواد مہیّا کرنا ہے۔ البتہ شمارے میں شامل تمام مضامین مصنفین کی ذاتی آراء پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا ادارے یا ادارے کے کسی فرد پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

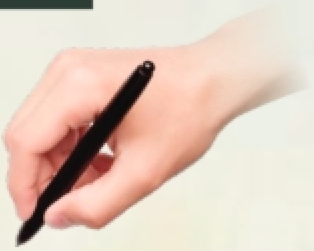

اداریہ

پاکستان اس وقت انتہائی مشکل حالات سے گزر رہا ہے، لیکن یہ کہانی نئی نہیں۔ پاکستان ایک لچکدار قوم ہے جو ماضی میں بھی مشکل ترین حالات سے کامیابی کے ساتھ گزر چکی ہے۔اس وقت ملک میں نئے صوبوں کے قیام کے حوالے سے بحث جاری ہے۔ وقت ہی بتائے گا کہ چھوٹے انتظامی یونٹس کا قیام یا مقامی حکومتوں کا مؤثر نظام ملک کے انتظامی ڈھانچے کو بہتر بنانے میں کس حد تک مددگار ثابت ہوتا ہے۔ حال ہی میں پیش آنے والا پمز اسپتال کا واقعہ ایسا سانحہ ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔اس معاملے میں سخت احتساب اور ذمہ داروں کا تعین ضروری ہوگا۔ دوسری جانب پاکستان میں توانائی کا بحران بھی بدستور موجود ہے، حالانکہ شمسی توانائی کے نظام میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اگر کھیلوں کی صورتحال پر نظر ڈالیں تو حالات بھی تشویشناک دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان حالیہ عرصے میں کسی حریف کو شکست دینے یا کوئی کرکٹ سیریز جیتنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ الزام تراشی کا سلسلہ جاری ہے، لیکن اصلاحات نظر نہیں آ رہیں۔

27 ستمبر کو مقبوضہ کشمیر کے مظلوم بہن بھائیوں سے اظہارِ یکجہتی کے لیے کشمیر کا یومِ سیاہ منایا گیا۔ بھارت اپنے مبینہ جارحانہ عزائم سے پیچھے نہیں ہٹ رہا اور ایک بار پھر سندھ طاس معاہدے کے معاملے میں دباؤ ڈالنے اور نئے تنازعات پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ماضی میں بھی بھارت کی جانب سے سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزیوں کے کئی واقعات سامنے آ چکے ہیں۔ عالمی عدالتِ انصاف کا حالیہ فیصلہ بھی اس معاملے میں پاکستان کے مؤقف کی تائید کرتا ہے۔

شکریہ

ایڈیٹر پاک جمہوریت

صوبوں سے اٹھنے والی بازگشت زور پکڑ گئی

بات ریفرنڈم تک جا پہنچی، پنجاب، سندھ اور ہزارہ صوبے کی تجاویز

امتیاز احمد تارڑ

(کالم نگار اور اینکر ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں)

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں انتظامی تقسیم کا سوال ہمیشہ ایک حساس اور پیچیدہ موضوع رہا ہے۔ کبھی یہ بحث پنجاب کے جنوبی اضلاع سے اٹھتی ہے، کبھی ہزارہ کے پہاڑی علاقوں سے اور کبھی سندھ کے شہری اور دیہی تقسیم سے۔ حالیہ دنوں میں ایک بار پھر یہ موضوع قومی منظرنامے پر نمایاں ہوا ہے، اور اس بار بحث محض نئے صوبوں کے مطالبے تک محدود نہیں بلکہ اس میں ریفرنڈم کے ذریعے عوامی رائے جاننے کی تجویز بھی شامل ہوگئی ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ عوامی رائے کو اہمیت دینے کی بات ہو رہی ہے، لیکن یہ سوال بھی اتنا ہی اہم ہے کہ کیا محض ریفرنڈم کسی ریاست کے انتظامی ڈھانچے میں اتنی بڑی تبدیلی کے لیے کافی ہے یا اس کے پیچھے ایک مربوط آئینی اور قانونی عمل کارفرما ہونا چاہیے؟ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ نئے صوبوں کا مطالبہ پاکستان کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ 1955 میں ون یونٹ کے نفاذ سے لے کر 1970 میں اس کے خاتمے تک اور اس کے بعد کے ہر عشرے میں، مختلف علاقوں سے انتظامی خودمختاری اور علیحدہ صوبائی حیثیت کے مطالبات سامنے آتے رہے ہیں۔ سرائیکی وسیب کی شناخت کا مسئلہ ہو، ہزارہ کی الگ صوبائی حیثیت کا مطالبہ ہو، یا کراچی اور شہری سندھ کے انتظامی مسائل یہ سب ایسے موضوعات ہیں، جو وقتاً فوقتاً سیاسی جماعتوں کے منشور، پارلیمانی قراردادوں اور احتجاجی تحریکوں کی صورت میں سامنے آتے رہے ہیں۔ اس تسلسل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ مطالبات کسی وقتی سیاسی مصلحت کی پیداوار نہیں بلکہ ان کے پیچھے عشروں پر محیط شکایات، توقعات اور مقامی شناختوں کا ایک پیچیدہ تانا بانا موجود ہے۔ اسی لیے اس بحث کو سرسری طور پر مسترد کرنا یا محض انتخابی نعرہ قرار دے کر نظر انداز کرنا مناسب حکمتِ عملی نہیں۔ اگر ہم غیر جانبداری سے اس بحث کا جائزہ لیں تو چند بنیادی عوامل ابھر کر سامنے آتے ہیں جن کی بنیاد پر نئے

صوبوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

پہلا عامل آبادی کا حجم اور رقبہ ہے۔ پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے، جس کی آبادی ملک کی کل آبادی کے نصف سے زیادہ یعنی ساڑھے 12 کروڑ ہے۔ اسی طرح سندھ میں بھی کراچی جیسے میگا سٹی سے لے کر اندرونِ سندھ کے دیہی اضلاع تک وسیع تنوع پایا جاتا ہے۔ ناقدین کا مؤقف ہے کہ اتنی بڑی آبادی اور رقبے کو ایک ہی انتظامی مرکز سے مؤثر طریقے سے چلانا مشکل ہو جاتا ہے، خاص طور پر جب دور دراز اضلاع کو صوبائی دارالحکومت تک رسائی میں مشکلات کا سامنا ہو۔

دوسرا عامل ترقیاتی عدم توازن ہے۔ یہ شکایت بار ہا سامنے آئی ہے کہ صوبائی وسائل کی تقسیم میں بعض علاقوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور بڑے شہری مراکز کے مقابلے میں دور دراز اضلاع ترقیاتی بجٹ، صحت، تعلیم اور بنیادی ڈھانچے کے حوالے سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ جنوبی پنجاب کے حامی اکثر یہ دلیل دیتے ہیں کہ لاہور مرکز اسمبلی اور انتظامیہ کی توجہ کا محور بنتا ہے جبکہ ملتان، بہاولپور اور ڈیرہ غازی خان جیسے علاقے نسبتاً کم وسائل حاصل کرتے ہیں۔

تیسرا عامل مقامی شناخت اور نمائندگی کا احساس ہے۔ ہزارہ کا مطالبہ اس کی واضح مثال ہے، جہاں علاقے کی جغرافیائی، لسانی اور ثقافتی امتیاز کی بنیاد پر الگ صوبائی حیثیت کی بات کی جاتی ہے۔ اسی طرح سندھ میں شہری اور دیہی تقسیم کے پیچھے بھی لسانی اور ثقافتی عوامل کارفرما ہیں، جہاں کراچی کی کاسموپولیٹن آبادی خود کو اندرونِ سندھ کی سیاسی حرکیات سے مختلف تصور کرتی ہے۔

چوتھا عامل حکمرانی کی فاصلاتی نوعیت ہے۔ نئے صوبوں کے حامیوں کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ چھوٹے انتظامی یونٹس عوام کے زیادہ قریب ہوتے ہیں، فیصلہ سازی تیز تر ہوتی ہے اور مقامی مسائل کو حل کرنے میں کم بیوروکریٹک رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔

اس بحث کا دوسرا رخ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ نئے صوبوں کی مخالفت کرنے والے حلقے بھی ٹھوس دلائل رکھتے ہیں، جن پر غور کرنا ضروری ہے۔ سب سے پہلے، سیاسی اور نسلی حساسیت کا مسئلہ ہے۔ خاص طور پر سندھ میں، صوبے کی تقسیم کی کسی بھی تجویز کو بعض سیاسی جماعتیں اور حلقے صوبے کی وحدت پر حملہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا مؤقف ہے کہ سندھ کی تاریخی، ثقافتی اور لسانی شناخت اس کی جغرافیائی وحدت سے جڑی ہوئی ہے اور کسی بھی تقسیم کو مخصوص سیاسی و آبادیاتی مقاصد کے حصول کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ تحفظات محض سیاسی بیان بازی نہیں بلکہ ان کی جڑیں تاریخی تجربات اور شناختی سیاست میں پیوست ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ انتظامی و مالی بوجھ کا ہے۔ نیا صوبہ بنانے کا مطلب صرف نقشے پر ایک نئی لکیر کھینچنا نہیں۔ اس کے ساتھ نئی صوبائی اسمبلی، گورنر ہاؤس، وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ، ہائی کورٹ کی بینچ یا مکمل عدالتی ڈھانچہ، پولیس کا الگ نظام، بلدیاتی ادارے اور ہزاروں نئے سرکاری ملازمین کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب اخراجات قومی خزانے پر اضافی بوجھ ڈالتے ہیں، ناقدین کا استدلال ہے کہ اس رقم کو موجودہ انتظامی

ڈھانچے کی بہتری اور وسائل کی منصفانہ تقسیم پر خرچ کرنا زیادہ سودمند ہو سکتا ہے۔

تیسرا نکتہ مالیاتی وسائل کی تقسیم یعنی این ایف سی ایوارڈ سے متعلق ہے۔ نیا صوبہ بننے سے قومی مالیاتی کمیشن کے ایوارڈ میں وسائل کی تقسیم کا فارمولا بھی متاثر ہوتا ہے، جو پہلے سے موجود صوبوں کے مابین ایک حساس اور طویل گفت و شنید کے بعد طے پانے والا معاملہ ہے۔ نئے یونٹس کی شمولیت اس توازن کو نئے سرے سے زیرِ بحث لا سکتی ہے، جس کے لیے تمام صوبوں کی رضامندی درکار ہوگی۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ کیا نیا انتظامی یونٹ بذاتِ خود مسائل کا حل ہے؟ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ اصل مسئلہ حکمرانی کے طریقہ کار، بدعنوانی اور وسائل کی غلط ترجیحات میں ہے نہ کہ انتظامی اکائی کے حجم میں۔ ان کے نزدیک اگر طرزِ حکمرانی نہ بدلی جائے تو چھوٹے صوبے بھی وہی مسائل نئے پیمانے پر دہرا سکتے ہیں، جو بڑے صوبوں کو درپیش ہیں۔

اب آتے ہیں اس اہم سوال کی طرف کہ ریفرنڈم کی تجویز کہاں تک قابلِ عمل ہے؟ بظاہر یہ ایک انتہائی جمہوری اور پرکشش خیال معلوم ہوتا ہے، عوام سے براہِ راست پوچھا جائے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ لیکن پاکستان کے آئینی ڈھانچے میں نئے صوبے کی تشکیل کا طریقہ کار پہلے سے متعین ہے، یہ محض عوامی ریفرنڈم کے نتیجے پر منحصر نہیں۔ آئینِ پاکستان کے آرٹیکل 239 کے تحت نئے صوبے کے قیام کے لیے پارلیمان کے دونوں ایوانوں یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ سے دو تہائی اکثریت سے منظوری درکار ہوتی ہے۔ اگر معاملہ کسی موجودہ صوبے کی حدود میں تبدیلی یا

اس کی تقسیم سے متعلق ہو تو متعلقہ صوبائی اسمبلی سے بھی دو تہائی اکثریت سے قرارداد کی منظوری ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محض ایک ریفرنڈم، چاہے وہ کتنا ہی وسیع پیمانے پر منعقد کیوں نہ کیا جائے، از خود کسی نئے صوبے کے قیام کی ضمانت نہیں دے سکتا، جب تک کہ اسے مذکورہ آئینی عمل کے ساتھ نہ جوڑا جائے۔ یہاں یہ سوال بھی اہم ہے کہ ریفرنڈم کا سوال کیا ہوگا، کس جغرافیائی حدود میں کرایا جائے گا، اس کے نتائج کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا یہ محض ایک مشاورتی نوعیت کا ریفرنڈم ہوگا، جس کے نتائج پارلیمان کے لیے پابند نہیں ہوں گے یا اسے کسی قانونی طریقہ کار سے پارلیمانی عمل کے ساتھ منسلک کیا جائے گا؟ یہ تمام تفصیلات طے کیے بغیر ریفرنڈم کی بات کرنا سیاسی طور پر پرکشش تو ہو سکتا ہے، مگر عملی طور پر ادھورا منصوبہ ہی رہے گا۔

مزید برآں، ریفرنڈم کے سوال کی تشکیل خود ایک حساس معاملہ ہے۔ اگر سوال مبہم ہو یا اسے مخصوص انداز میں ترتیب دیا جائے تو نتائج متنازع ہو سکتے ہیں۔ کسی بھی ریفرنڈم کی ساکھ کے لیے ضروری ہے کہ اسے شفاف، غیر جانبدار اور تمام اسٹیک ہولڈرز کی رضامندی سے ترتیب دیا جائے، ورنہ یہ اتفاق رائے پیدا کرنے کے بجائے مزید تقسیم اور تنازع کا باعث بن سکتا ہے۔ اس پوری بحث میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ نیا صوبہ بنانے کا معیار کیا ہونا چاہیے؟ اگر یہ معیار واضح اور یکساں طور پر متعین نہ کیا جائے تو یہ بحث سیاسی مفادات کے تابع ہو کر رہ جائے گی، جہاں جس علاقے کی سیاسی قیادت زیادہ مضبوط ہوگی، اسے صوبہ مل جائے گا اور جہاں سیاسی آواز کمزور ہوگی، وہ نظر انداز ہو جائے گا۔ اگر آبادی کو معیار بنایا جائے تو یہ طے ہونا چاہیے کہ کم از کم کتنی آبادی ایک نئے صوبے کے لیے ضروری تصور کی جائے گی۔ اگر رقبہ اور جغرافیائی فاصلہ معیار ہو تو اس کے لیے بھی واضح پیمانہ درکار ہوگا۔ اگر معاشی خود کفالت کو دیکھا جائے تو یہ جانچنا ہوگا کہ آیا نیا صوبہ اپنے انتظامی اخراجات پورے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا وہ مکمل طور پر وفاقی گرانٹس پر انحصار کرے گا۔ اگر لسانی و ثقافتی شناخت کو بنیاد بنایا جائے تو یہ بھی متعین کرنا ہوگا کہ کس حد تک تنوع ایک الگ انتظامی اکائی کا جواز بنتا ہے۔ ایک جامع، شفاف اور قابلِ اطلاق فریم ورک کے بغیر یہ بحث ہمیشہ ادھوری اور متنازع رہے گی۔ ایسا فریم ورک ایک آئینی کمیشن، پارلیمانی کمیٹی یا کسی غیر جانبدار ادارے کی نگرانی میں تیار کیا جا سکتا ہے، جس میں تمام صوبوں اور سیاسی جماعتوں کی نمائندگی شامل ہو۔ اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نئے صوبوں کا مطالبہ نہ تو مکمل طور پر مسترد کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے جذباتی نعروں کی بنیاد پر فوری طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ درمیانی راستہ یہ ہے کہ اس معاملے کو ایک سنجیدہ، اعداد و شمار پر مبنی اور آئینی عمل کے تحت آگے بڑھایا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ایک غیر جانبدار پارلیمانی یا آئینی کمیشن تشکیل دیا جائے جو ملک بھر سے نئے انتظامی یونٹس کے تمام مطالبات کا جائزہ لے۔ اس کمیشن کو آبادی، رقبہ، معاشی استعداد، ترقیاتی ضروریات اور عوامی رائے جیسے تمام پہلوؤں کا موازنہ کرتے ہوئے یکساں معیار وضع کرنا چاہیے۔

اگر رائے شماری یا ریفرنڈم کا سہارا لیا جائے تو اسے اس آئینی عمل کا حصہ بنایا جائے، نہ کہ اسے ایک الگ تھلگ اور غیر پابند سیاسی

اقدام کے طور پر پیش کیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس بحث کو کسی ایک صوبے یا علاقے تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ملک بھر میں یکساں اصول لاگو کیے جائیں۔ اگر جنوبی پنجاب کے لیے کوئی معیار مقرر کیا جاتا ہے تو وہی معیار ہزارہ اور سندھ کے کسی بھی خطے پر بھی لاگو ہونا چاہیے۔ یہی شفافیت اس عمل کو سیاسی تعصب سے پاک اور قابلِ قبول بنائے گی۔

نئے صوبوں کی بحث بنیادی طور پر بہتر حکمرانی، مؤثر خدمات کی فراہمی اور عوام کی نمائندگی کے حوالے سے ایک جائز اور اہم سوال ہے۔ لیکن اس کا حل جذباتی نعروں، سیاسی مصلحتوں یا وقتی مقبولیت کے حصول میں نہیں بلکہ ٹھوس آئینی عمل، واضح معیار اور تمام اسٹیک ہولڈرز کے اتفاقِ رائے میں پنہاں ہے۔ ریفرنڈم اگر عوامی رائے جاننے کا ایک ذریعہ بنایا جائے تو اسے پارلیمانی اور آئینی طریقہ کار سے مربوط ہونا چاہیے، ورنہ یہ محض ایک علامتی اقدام بن کر رہ جائے گا جو حقیقی تبدیلی لانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

بالآخر سوال یہ نہیں کہ کون سا علاقہ صوبہ بنے گا اور کون سا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ پاکستانی ریاست اپنے شہریوں کو کس طرح بہتر، شفاف اور قریب تر حکمرانی فراہم کر سکتی ہے۔ اگر اس اصل مقصد کو سامنے رکھ کر آگے بڑھا جائے تو نئے صوبوں کی بحث محض سیاسی تقسیم کا ذریعہ بننے کے بجائے ایک تعمیری قومی مکالمے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

بھارتی آبی جارحیت، ہٹ دھرمی اور
پاکستانی مئوقف کی قانونی وسفارتی فتح

محمد زکریا

(مصنف، کالم نگار ہیں اور پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں)

چھ دہائیوں سے زائد معیاد پر محیط ایک ایسا معاہدہ جس نے دشمنی کے باوجود پانی کو جنگ کا میدان بننے سے روکے رکھا، مگر آج اس کی قانونی اور سیاسی بنیاد ایک نئے امتحان سے گزر رہی ہے۔ دریا کبھی سرحدوں سے اجازت نہیں مانگتے۔ وہ پہاڑوں سے نکلتے ہیں، وادیوں سے گزرتے ہیں، میدانوں کو سیراب کرتے ہیں اور پھر سمندر میں جا گرتے ہیں۔ لیکن جب انہی دریاؤں کے درمیان ریاستی سرحدیں کھینچ دی جائیں تو پانی صرف پانی نہیں رہتا؛ وہ سیاست، معیشت، زراعت، خوراک، توانائی اور قومی سلامتی کا سوال بن جاتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا اس حقیقت کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ آج جب سندھ طاس معاہدہ ایک مرتبہ پھر پاکستان اور بھارت کے درمیان شدید قانونی اور سیاسی تنازع کا مرکز بنا ہوا ہے تو شاید یہ یاد کرنا زیادہ ضروری ہے کہ یہ معاہدہ آخر وجود میں کیوں آیا تھا، اس کے پیچھے کتنی تاریخ تھی، اور وہ کون سا بحران تھا جس نے بالآخر دونوں ملکوں کو یہ باور کرایا کہ دریاؤں کو جنگ کے بجائے قانون کے حوالے کرنا ہوگا۔

اس کہانی کی ابتدا 1960 سے نہیں بلکہ 1947 سے ہوتی ہے۔ برصغیر صرف دو حصوں میں تقسیم نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے ایک ایسے نہری نظام کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا تھا جس کی تشکیل سیاسی سرحدوں سے نہیں بلکہ صدیوں سے جاری قدرتی بہاؤ کے مطابق ہوئی تھی۔ پنجاب کے وسیع میدانوں کو سیراب کرنے والا نہری نظام اس وقت کی ہندوستانی پنجاب کی سرزمین، دریاؤں اور ہیڈ ورکس سے جڑا ہوا تھا، جبکہ

ان نہروں سے سیراب ہونے والے بے شمار علاقے نئی ریاست پاکستان میں شامل ہو گئے۔ یوں ایک عجیب صورت حال پیدا ہوئی: پانی کا منبع اور اس کی تقسیم کا ایک حصہ ایک ملک میں تھا، جبکہ اس پانی پر انحصار کرنے والے وسیع زرعی علاقے دوسرے ملک میں۔ یہ صرف جغرافیائی مسئلہ نہیں تھا۔ پاکستان ایک نئی ریاست تھی، جس کی معیشت بڑی حد تک زراعت پر منحصر تھی۔ لاکھوں کسانوں کی فصلیں، وہیں روزگار، خوراک کی فراہمی اور ملک کی معاشی سرگرمی نہری پانی سے وابستہ تھی۔ تقسیم کے فوراً بعد یہ سوال پیدا ہو گیا کہ اگر پانی کا کنٹرول سرحد کے دوسری جانب موجود ہے تو کیا پاکستان اپنی زرعی زندگی کے لیے مستقل طور پر کسی دوسرے ملک کی رضامندی کا محتاج رہے گا؟

1948 میں یہ خدشہ عملی بحران میں تبدیل ہوا۔ یکم اپریل 1948 کو بھارت کی جانب سے مشرقی پنجاب کے بعض ہیڈ ورکس سے پاکستان جانے والے نہری پانی کی ترسیل روک دی گئی۔ یہ واقعہ دونوں ملکوں کے درمیان پانی کے پہلے بڑے بحران کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس وقت مسئلہ صرف چند نہروں میں پانی کی کمی کا نہیں تھا؛ نئی ریاست پاکستان کے لیے یہ سوال اس کی معاشی بقا سے جڑا ہوا تھا۔ بعد میں دونوں ملکوں کے درمیان عارضی انتظامات اور مذاکرات ہوئے، مگر 1948 کا تجربہ ایک بنیادی سبق چھوڑ گیا: اگر پانی کا مسئلہ کسی مستقل قانونی بندوبست کے بغیر رہا تو ہر سیاسی بحران کے ساتھ آبی بحران کا خطرہ بھی پیدا ہوگا۔

یہیں سے سندھ طاس کی طویل سفارتی کہانی شروع ہوتی ہے۔ 1950 کی دہائی میں پانی کا مسئلہ دونوں ملکوں کے درمیان مسلسل مذاکرات کا موضوع بنا رہا۔ عالمی بینک کے اس وقت کے صدر یوجین بلیک نے اس تنازعے کو حل کرنے کے لیے ثالثی کا کردار ادا کیا۔ مذاکرات آسان نہیں تھے۔ سوال صرف یہ نہیں تھا کہ کس دریا کا پانی کس ملک کو ملے گا؛ سوال یہ تھا کہ ایک ایسے وسیع اور پیچیدہ دریائی نظام کو کس طرح تقسیم کیا جائے جس میں صدیوں سے قائم آبپاشی کا نظام، نئے ملکوں کی ضروریات، مستقبل کے ڈیم، نہریں، بجلی کے منصوبے اور لاکھوں کسانوں کی خوشحالی بھی سلامت رہے اور دونوں ممالک بھی اس تقسیم پر رضامند ہوں۔

تقریباً نو برس تک بات چیت جاری رہی۔ آج کے دور میں جہاں ریاستیں چند ہفتوں میں معاہدے توڑنے یا تعلقات ختم کرنے کے اعلانات کر دیتی ہیں، وہاں یہ بات غیر معمولی معلوم ہوتی ہے کہ ایک ایسے تنازعے پر تقریباً ایک دہائی تک مذاکرات جاری رہے جس میں دونوں ملکوں کے درمیان اعتماد پہلے ہی انتہائی کم تھا۔ لیکن بالآخر 19 ستمبر 1960 کو کراچی میں وہ دن آیا جب پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور بھارت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے سندھ طاس معاہدے پر دستخط کیے۔ عالمی بینک کے نائب صدر ڈبلیو اے بی ایلف بھی اس تاریخی موقع پر موجود تھے اور عالمی بینک نے معاہدے پر دستخط کیے۔

یہ صرف ایک معاہدہ نہیں تھا؛ یہ اس وقت کے جنوبی ایشیا کے لیے ایک غیر معمولی سفارتی تجربہ تھا۔ ایک طرف دو ایسے ممالک تھے جو کشمیر سمیت کئی بنیادی مسائل پر ایک دوسرے کے مخالف تھے، دوسری طرف انہی دونوں ریاستوں نے پانی جیسے انتہائی حساس مسئلے کے لیے

ایک ایسا نظام تشکیل دیا جس میں دریا، نہریں اور پن بجلی کے منصوبے سیاسی بیانات کے بجائے قانونی دفعات کے تابع کیے گئے۔ معاہدے کے تحت دریائے سندھ، جہلم اور چناب کو مغربی دریا قرار دے کر ان کے پانی کے استعمال کا بنیادی حق پاکستان کو دیا گیا، جبکہ راوی، بیاس اور ستلج مشرقی دریا قرار پائے اور ان کے پانی کے استعمال کا بنیادی حق بھارت کو حاصل ہوا۔ لیکن یہاں بھی کہانی اتنی سادہ نہیں تھی کہ صرف تین دریا ادھر اور تین ادھر کر دیے گئے۔ معاہدے میں مغربی دریاؤں پر بھارت کے مخصوص استعمال، خصوصاً پن بجلی پیدا کرنے کے لیے رن آف دی ریور منصوبوں، کے لیے تفصیلی شرائط مقرر کی گئیں۔ اسی طرح معاہدے نے مستقبل کے منصوبوں، پانی کے بہاؤ، معلومات کے تبادلے اور تکنیکی اختلافات کے حل کے لیے بھی قواعد وضع کیے۔

یہ معاہدہ اس دور میں ہوا جب دنیا سرد جنگ کے عروج پر تھی۔ امریکا اور سوویت یونین عالمی سیاست کو دو بڑے کیمپوں میں تقسیم کر چکے تھے۔ ایشیا میں چین اور بھارت کے تعلقات بھی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے اور 1962 کی جنگ ابھی چند سال دور تھی۔ پاکستان اور بھارت خود بھی ایک دوسرے کے ساتھ شدید سیاسی اختلافات میں گھرے ہوئے تھے۔ ایسے ماحول میں پانی پر اتفاق ایک معمولی سفارتی کامیابی نہیں تھی۔

معاہدے کے ساتھ ایک اور اہم انتظام بھی ہوا۔ پاکستان کے لیے دریاؤں کے متبادل نظام اور آبپاشی کے انفراسٹرکچر کی تعمیر میں مدد

کے لیئے Indus Basin Development Fund قائم کیا گیا۔ عالمی بینک کے تاریخی ریکارڈ کے مطابق اس فنڈ کی مالیت تقریباً 900 ملین ڈالر تھی اور اس کا مقصد ایسے منصوبوں کی تعمیر میں مدد کرنا تھا جو معاہدے کے بعد پاکستان کو اپنے حصے کے پانی کو مؤثر طریقے سے استعمال کرنے کے قابل بنائیں۔ اس وقت عالمی بینک کے مطابق دونوں ملکوں میں تقریباً پانچ کروڑ لوگوں کا روزگار سندھ طاس کے پانی سے وابستہ تھا۔

یہ اعداد و شمار آج کے قاری کے لیے شاید محض تاریخی معلومات محسوس ہوں، لیکن اس وقت ان کا مطلب بہت بڑا تھا۔ ایک نئی ریاست کے لیے جس کی معیشت زراعت پر قائم تھی، پانی صرف قدرتی وسیلہ نہیں بلکہ معاشی زندگی کی بنیاد تھا۔ پھر تاریخ نے معاہدے کا امتحان لینا شروع کیا۔ 1965 میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ ہوئی۔ پانچ برس پہلے کراچی میں جس معاہدے پر دونوں ملکوں نے دستخط کیے تھے، اس وقت دونوں ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف میدانِ جنگ میں تھیں۔ مگر پانی کا معاہدہ برقرار رہا۔ 1971 میں ایک اور جنگ ہوئی، پاکستان دولخت ہوا اور خطے کا سیاسی نقشہ تبدیل ہو گیا، لیکن سندھ طاس معاہدہ پھر بھی قائم رہا۔ اس کے بعد بھی کشمیر، سیاچن، سرحدی جھڑپوں، کارگل اور دہشت گردی کے الزامات نے دونوں ملکوں کے تعلقات کو بار بار انتہائی کشیدہ کیا۔ مگر دریاؤں کے لیے بنایا گیا قانونی نظام مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ یہی سندھ طاس معاہدے کی تاریخی انفرادیت ہے۔

دنیا میں بہت سے بین الاقوامی معاہدے سیاسی بحرانوں کے ساتھ کمزور پڑ گئے، مگر سندھ طاس نے جنگوں کے درمیان بھی اپنی جگہ برقرار رکھی۔ عالمی بینک بھی اسے ایسے معاہدوں میں شمار کرتا ہے جو شدید سیاسی کشیدگی اور تنازعات کے باوجود نصف صدی سے زیادہ عرصے تک آبپاشی اور پن بجلی کے معاملات کے لیے فریم ورک فراہم کرتا رہا۔

اس کی ایک وجہ معاہدے کا ادارہ جاتی ڈھانچہ تھا۔ Permanent Indus Commission کے ذریعے دونوں ملکوں کے انڈس واٹر کمشنرز کے درمیان رابطے کا نظام بنایا گیا۔ سوالات کے لیے کمیشن، مخصوص نوعیت کے اختلافات کے لیے Expert Neutral اور تنازعات کے لیے Court of Arbitration کا راستہ رکھا گیا۔ یعنی معاہدے نے صرف یہ نہیں بتایا کہ پانی کس کا ہے؛ اس نے یہ بھی بتایا کہ اگر دونوں ملک اس پانی کے استعمال پر اختلاف کریں تو اختلاف کو کہاں لے جانا ہے۔ یہی نکتہ آج کے بحران کو سمجھنے کے لیے بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان گزشتہ کئی دہائیوں میں بڑے آبی اختلافات پیدا ہوئے۔ بگلیہار ڈیم کا معاملہ Neutral Expert تک گیا۔ کشن گنگا منصوبے کا تنازع ثالثی کے مرحلے تک پہنچا اور 2013 میں Court of Arbitration نے فیصلہ دیا۔ یعنی معاہدے کا نظام صرف کاغذ پر موجود نہیں رہا بلکہ مختلف اوقات میں عملی طور پر استعمال بھی ہوا۔

2016 میں کشن گنگا اور رتلے منصوبوں کے ڈیزائن سے متعلق اختلافات ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئے۔ پاکستان نے Court of Arbitration کے قیام کی درخواست کی جبکہ بھارت نے Neutral Expert کے طریقہ کار کی حمایت کی۔ عالمی بینک نے دونوں عمل کے درمیان پیچیدگی کو دیکھتے ہوئے 2016 میں کچھ عرصے کے لیے کارروائی روکنے کی کوشش کی تاکہ دونوں ملک باہمی حل تلاش کرسکیں۔ پانچ سال کی کوششوں کے بعد 2022 میں یہ عمل دوبارہ آگے بڑھایا گیا۔

یہ تاریخ اس لیے اہم ہے کہ آج کا تنازع اچانک پیدا نہیں ہوا۔ اس کی جڑیں کئی دہائیوں پر محیط تکنیکی اور قانونی اختلافات میں موجود ہیں۔ رتلے پن بجلی منصوبہ اسی طویل داستان کا تازہ باب ہے۔ دریائے چناب پر واقع اس منصوبے کے ڈیزائن اور پانی کے استعمال سے متعلق پاکستان اور بھارت کے مؤقف مختلف ہیں۔ پاکستان کو خدشہ ہے کہ بعض تکنیکی خصوصیات مستقبل میں پانی کے بہاؤ کو متاثر کرسکتی ہیں، جبکہ بھارت کا مؤقف ہے کہ اسے سندھ طاس معاہدے کے تحت مغربی دریاؤں پر مخصوص شرائط کے اندر پن بجلی منصوبے بنانے کا حق حاصل ہے۔ یہاں جذبات سے زیادہ انجینئرنگ اہم ہوجاتی ہے۔ ڈیم کی اونچائی، ذخیرے کی گنجائش، پانی کے اخراج کا طریقہ، گیٹس کا ڈیزائن اور بجلی کی پیداوار کے لیے پانی کے استعمال کا طریقہ، یہ سب وہ تفصیلات ہیں جو بظاہر عام قاری کے لیے خشک تکنیکی موضوعات ہیں، لیکن دراصل یہی چھوٹی چھوٹی تفصیلات پاکستان اور بھارت کے درمیان بڑے قانونی مقدمات کی بنیاد بنتی ہیں۔

اسی پس منظر میں دی ہیگ کی Court of Arbitration کی حالیہ کارروائی اہم ہے۔ 31 اگست 2026 کے سرکاری ریکارڈ

میں سندھ طاس معاہدے کے حوالے سے بھارت کے "abeyance" فیصلے کی قانونی حیثیت اور رتلے منصوبے سے متعلق الگ عبوری حکم درج ہے۔اس کارروائی کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ تنازع اب صرف کسی ایک ڈیم کے گیٹ یا پانی کے چند فیصد حصے تک محدود نہیں رہا؛ اصل سوال معاہدے کے تسلسل، اس کے ادارہ جاتی نظام اور فریقین کی قانونی ذمہ داریوں سے متعلق ہے۔

ہیگ میں قائم ثالثی عدالت سے متعلق حالیہ پیش رفت نے ایک مرتبہ پھر جنوبی ایشیا میں پانی کے مسئلے کو محض آبی تقسیم کے معاملے کے بجائے سیاست، طاقت، بین الاقوامی قانون اور علاقائی سلامتی کے وسیع تر تناظر میں لا کھڑا کیا ہے۔حالیہ قانونی پیش رفت نے اسی پرانے تنازع کو ایک نئے مرحلے میں پہنچا دیا ہے۔اس بحث کا ایک بنیادی پہلو یہ ہے کہ بین الاقوامی معاہدوں کی حیثیت ریاستوں کی بدلتی ہوئی سیاسی ترجیحات سے کس حد تک متاثر ہو سکتی ہے۔سندھ طاس معاہدہ اس لحاظ سے ایک حساس مثال ہے، کیونکہ اس کے فریق صرف دو ہمسایہ ممالک ہی نہیں بلکہ دونوں جوہری صلاحیت رکھنے والی ریاستیں بھی ہیں۔اس لیے پانی سے متعلق کسی بڑے تنازع کے اثرات صرف زراعت یا معیشت تک محدود رہنے کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

بھارت کی موجودہ پالیسی کو سمجھنے کے لیے اس کے داخلی سیاسی ماحول کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔گزشتہ برسوں میں بھارت کی سیاست میں قومی سلامتی، سرحدی تنازعات اور پاکستان کے ساتھ تعلقات نمایاں سیاسی موضوعات رہے ہیں۔پلوامہ حملے کے بعد پیدا ہونے والی کشیدگی، بالاکوٹ کارروائی، مقبوضہ جموں و کشمیر کی آئینی حیثیت میں تبدیلی اور اس کے بعد پیدا ہونے والے سفارتی و عسکری تناؤ نے دونوں ممالک کے تعلقات کو مزید پیچیدہ کیا۔تاہم ان واقعات کے سیاسی اثرات کے بارے میں مختلف حلقوں کی مختلف تشریحات موجود ہیں، اس لیے ان تمام اقدامات کو محض ایک ہی داخلی سیاسی مقصد کے تحت قرار دینا ایک پیچیدہ معاملے کو حد سے زیادہ سادہ بنا سکتا ہے۔البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ جب کسی ملک کی خارجہ پالیسی میں قومی سلامتی اور پڑوسی ملک کے ساتھ کشیدگی مستقل سیاسی موضوع بن جائے تو مذاکرات اور مفاہمت کے لیے دستیاب سیاسی گنجائش متاثر ہو سکتی ہے۔جنوبی ایشیا میں یہ مسئلہ اس لیے بھی اہم ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اعتماد پہلے ہی محدود ہے۔ایسے ماحول میں پانی جیسے بنیادی مسئلے کو سخت سیاسی زبان میں پیش کیے جانے سے غلط فہمیوں اور بد اعتمادی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

پانی کا مسئلہ اس لیے بھی غیر معمولی حساسیت رکھتا ہے کہ یہ محض ریاستی مفاد کا سوال نہیں۔دریائے سندھ کا نظام کروڑوں انسانوں کی زندگی، زراعت، خوراک، روزگار اور توانائی کے شعبوں سے منسلک ہے۔پاکستان کی زرعی پیداوار، آبپاشی کا نظام اور دیہی معیشت بڑی حد تک دریائی پانی اور نہری نظام سے وابستہ ہیں۔اس لیے پانی کے بہاؤ میں طویل مدتی غیر یقینی پیدا ہونا ایک ایسے معاشرے کے لیے معاشی اور انسانی سطح پر سنگین اثرات پیدا کر سکتا ہے جو پہلے ہی پانی کی دستیابی، آبادی میں اضافے اور موسمیاتی تبدیلی جیسے مسائل کا سامنا کر رہا ہے۔یہی وجہ

ہے کہ سندھ طاس معاہدے پر ہونے والی بحث کو صرف پاکستان اور بھارت کی باہمی کشمکش کے زاویے سے دیکھنا کافی نہیں۔ اس معاملے کا تعلق بین الاقوامی قانون کے بنیادی اصولوں، معاہدوں کی پابندی، تنازعات کے پرامن حل اور ریاستی ذمہ داری سے بھی ہے۔ اگر دو ریاستیں کسی معاہدے کے ذریعے کئی دہائیوں تک ایک پیچیدہ مسئلے کو منظم کرتی رہی ہوں تو اس معاہدے کے مستقبل سے متعلق ہر قدم وسیع تر علاقائی اثرات کا حامل ہوسکتا ہے۔

بھارت خود کو ایک ابھرتی ہوئی عالمی طاقت اور عالمی معیشت میں بڑھتے ہوئے کردار کے حامل ملک کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس حیثیت کے ساتھ بین الاقوامی اداروں اور معاہداتی ذمہ داریوں کے بارے میں اس کا طرزِ عمل بھی عالمی توجہ کا موضوع بنتا ہے۔ کسی بھی بڑی یا ابھرتی ہوئی طاقت کے لیے اصل چیلنج صرف معاشی اور عسکری قوت حاصل کرنا نہیں بلکہ اس قوت کے ساتھ ادارہ جاتی ذمہ داری اور بین الاقوامی اصولوں کے احترام کو برقرار رکھنا بھی ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں سندھ طاس معاہدے سے متعلق حالیہ قانونی تنازع کو دیکھا جارہا ہے۔ تاہم پاکستان کے لیے بھی اس صورتحال کا جواب صرف سفارتی بیانات یا بین الاقوامی فورمز تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ پاکستان کو اپنے آبی حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنے داخلی آبی انتظام کو بھی بہتر بنانا ہوگا۔ پانی کے ضیاع میں کمی، ذخیرہ کرنے کی صلاحیت میں اضافہ، نہری نظام کی بہتری، جدید آبپاشی، زیرِ زمین پانی کے محتاط استعمال اور موسمیاتی تبدیلی کے اثرات سے نمٹنے کے لیے طویل مدتی منصوبہ بندی اب قومی ضرورت بن چکی ہے۔ سندھ طاس معاہدہ بیرونی سطح پر ایک قانونی تحفظ فراہم کرسکتا ہے، مگر اندرونی آبی انتظام کی کمزوریوں کا متبادل نہیں بن سکتا۔

جنوبی ایشیا میں امن صرف سرحدوں پر خاموشی کا نام نہیں۔ پائیدار امن کے لیے پانی، تجارت، معیشت، ماحولیات اور انسانی سلامتی جیسے بنیادی معاملات پر بھی قابلِ اعتماد نظام درکار ہے۔ سندھ طاس معاہدہ اسی ضرورت کا ایک تاریخی جواب تھا۔ اب آنے والا وقت یہ طے کرے گا کہ اس تاریخی انتظام کو مزید مضبوط بنانے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے یا پانی بھی ان مسائل کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے جہاں سیاست اور طاقت نے قانون اور ادارہ جاتی تعاون پر سبقت حاصل کرلی ہے۔

دریا کسی پارلیمان کے تابع نہیں ہوتے، نہ ان کی روانی انتخابی نعروں سے بدلتی ہے۔ وہ پہاڑوں سے نکلتے ہیں، سرحدوں کو عبور کرتے ہیں اور لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو چھوتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اسی لیے سندھ طاس کا اصل سبق شاید یہی ہے کہ پانی کو اگر تنازع کا ذریعہ بنایا جائے تو اس کے اثرات نسلوں تک پہنچ سکتے ہیں، لیکن اگر اسے قانون، مذاکرات اور باہمی ذمہ داری کے دائرے میں رکھا جائے تو یہی پانی دو متحارب ریاستوں کے درمیان کم از کم ایک ایسا راستہ قائم رکھ سکتا ہے جہاں اختلاف کے باوجود رابطہ باقی رہے۔

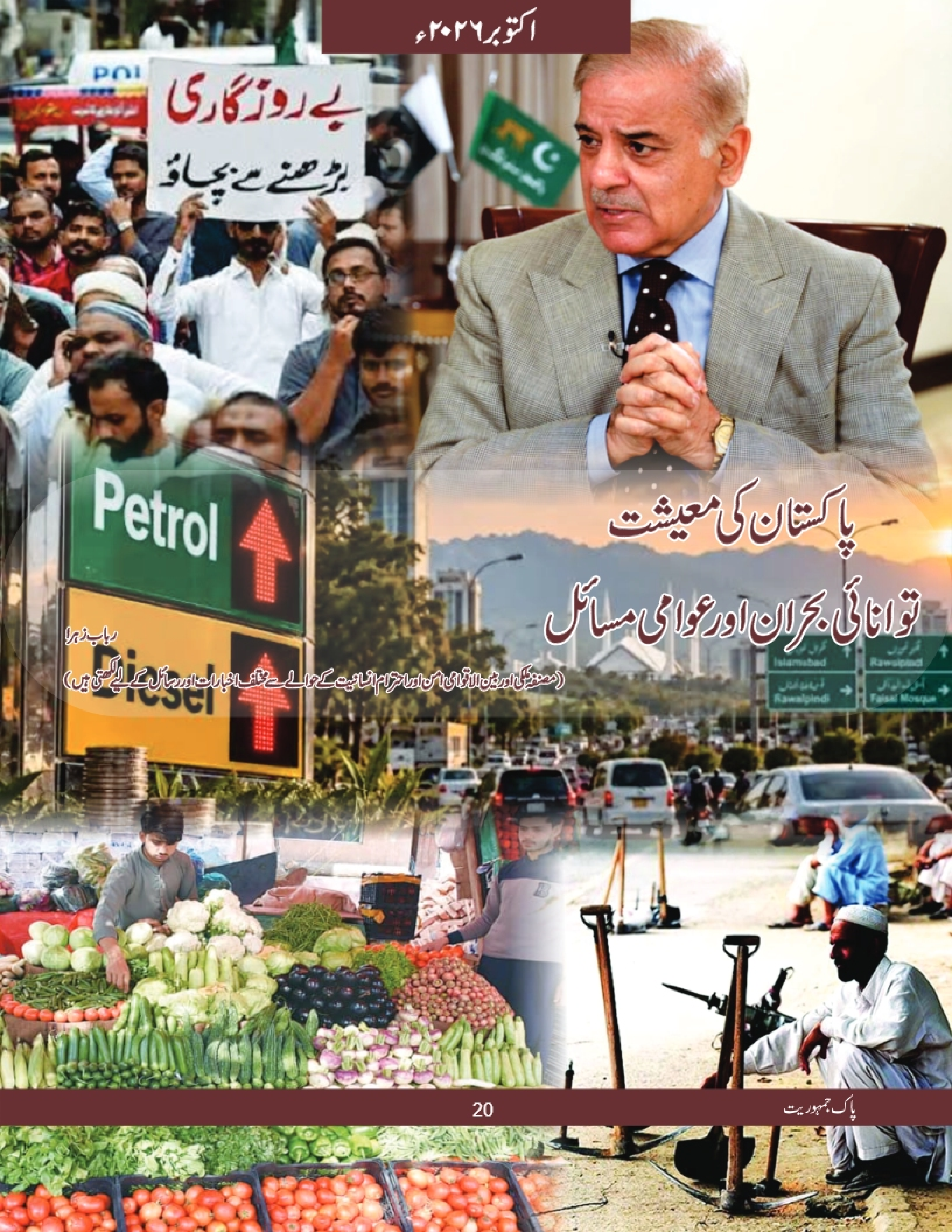

پاکستان کی معیشت
توانائی بحران اور عوامی مسائل

رباب زہرا

(مصنفہ ملکی اور بین الاقوامی امن اور احترام انسانیت کے حوالے سے مختلف اخبارات اور رسائل کے لیے لکھتی ہیں)

دنیا کے موجودہ حالات میں ایک بڑا مسئلہ معاشی بحران کا ہے، جس میں ایران پر مسلط جنگ نے غیر معمولی اضافہ کیا۔ ایسے میں بھلا پاکستان جیسا ترقی پذیر ملک کیسے نہ متاثر ہوتا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک ان حالات سے پہلے بھی معیشت کے بحران میں مبتلا تھے، جس میں درآمدی وسائل سے توانائی حاصل کرنے والے کم ترقی یافتہ ممالک اپنے محدود وسائل اور لاتعداد مسائل کے ہاتھوں مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ ایسے میں امریکہ، اسرائیل اور ایران کی جنگ نے بے تحاشا اضافہ کر دیا۔

بدقسمتی سے پاکستان ایک طویل عرصے سے معاشی بحران کا سامنا کر رہا ہے۔ اس کی وجوہات ماضی کی حکومتوں کی وقتی اور ناقص پالیسیاں بھی قرار دی جاتی ہیں، لیکن ”لمحۂ موجود“ میں مسئلہ بجٹ خسارے یا قرضوں تک محدود نہیں رہا، نہ روپے کی قدر کھونے پر الزام لگایا جا سکتا ہے، کیونکہ پاکستان اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے ترقی اور خوشحالی کی راہ پر پُرعزم انداز میں آگے بڑھنے کا خواہش مند تھا۔ ایسے میں ایندھن، بجلی کی قیمت، آٹے، دیگر خورونوش کی دستیابی اور مہنگائی کے دباؤ نے ہر پاکستانی کو متاثر کیا۔ یقیناً جب بجلی کا گھریلو بل، موٹر سائیکل کا پٹرول اور باورچی خانے کا راشن اچانک مہنگا ہو جائے تو پھر معاشی بحران صرف سرکاری اعداد و شمار تک محدود نہیں رہتا، بلکہ روزمرہ زندگی اور ہر کسی کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

پاکستان کی سب سے بڑی کمزوری توانائی کے حصول کے لیے غیر ملکی ذرائع ہیں، کیونکہ یہ ضرورت درآمدی تیل اور دیگر توانائی ذرائع سے ہی پوری کی جاتی ہے۔ لہٰذا عالمی منڈی میں تیل کی قیمت بڑھے، روپے کی قدر میں کمی ہو یا خطے میں سیاسی کشیدگی رونما ہو — اس کے اثرات سے پاکستانی صارف محفوظ نہیں رہ سکتا، کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ صرف تیل کی قیمت بڑھنے سے زراعت، صنعت اور تمام کاروبار کی لاگت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ تمام تر سامان کی نقل وحمل گاڑیوں کے ذریعے ہی ہوتی ہے، جو ڈائریکٹ پٹرول اور ڈیزل کی مہنگائی سے مہنگی ہو جاتی ہے۔

صرف یہی نہیں، توانائی کے شعبے میں ایک بڑا مسئلہ بجلی کی قیمت اور گردشی قرضے بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر گزشتہ چند برسوں کا تجزیہ کیا جائے تو بجلی کی قیمتوں کے اضافے نے صرف گھریلو صارفین کو متاثر نہیں کیا، بلکہ صنعتوں کو بھی شدید دباؤ میں رکھا۔ اس سلسلے میں بجلی کی پیداواری لاگت کے علاوہ بجلی چوری، لائن لاسز، ناقص وصولی سسٹم ہی نہیں، بجلی پیدا کرنے والی کمپنیوں کے ساتھ کیے گئے غیر معمولی معاہدے بھی ہیں، جس کی وجہ سے حکومت کے لیے توانائی کے شعبے کو مثبت انداز میں چلانا نہ صرف مشکل ہو چکا ہے بلکہ صارفین کے لیے بجلی کا استعمال بھی مہنگا ہے۔

پاکستان نے اس مسئلے کا متبادل شمسی توانائی ڈھونڈا، بلکہ اس پر تیزی سے عمل درآمد بھی کیا، جس کے نتیجے میں گھروں، کارخانوں، دکانوں اور زرعی شعبے میں سولر سسٹم کے استعمال میں نمایاں اضافہ بھی ہوا۔ حقیقی طور پر یہ تبدیلی مستقبل میں درآمدی ایندھن پر انحصار کم کرنے کا باعث بنے گی، لیکن ایسا جب بھی ممکن ہو سکے گا جب اس سلسلے میں واضح اور مستقل پالیسی بنائی جائے گی، کیونکہ پالیسی میں بار بار تبدیلی سے سرمایہ کاروں اور صارفین میں اعتماد سازی ممکن نہیں، جس کے مثبت کی بجائے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اگر پاکستان کے معاشی بحران کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح نظر آئے گی کہ توانائی صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں، اس کے ساتھ ساتھ پانی کا بحران بھی ایک معاشی خطرہ ہے۔ پاکستان زرعی ملک ہے، اس کی زراعت کا بڑا حصہ دریائے سندھ کے نظام سے جڑا ہوا ہے، جبکہ موسمی تبدیلی، بارشوں کے غیر متوازن نظام، گلیشیئر کی ٹوٹ پھوٹ، زیرِ زمین پانی کے بے تحاشا استعمال اور پانی ذخیرہ کرنے کی محدود صلاحیتوں نے بھی مسائل کو پیچیدہ کر دیا ہے۔

کسی بھی زرعی ملک میں پانی کی قلت سے خوراک کی قیمت پر براہِ راست اثر پڑتا ہے، کیونکہ اگر کسان کو فصل کے لیے مناسب پانی میسر نہ ہو تو گندم، چاول، کپاس، گنا ہی نہیں، تمام فصلوں کی پیداوار متاثر ہوتی ہے، جس سے منڈیوں میں طلب کے مطابق رسد ممکن نہیں ہوتی، لہٰذا قیمتوں میں اضافہ بڑھ جاتا ہے۔ اسی لیے پانی بحران کو صرف ماحولیاتی مسئلہ سمجھنا غلط ہے۔ یہ خوراک، روزگار، برآمدات اور ملک کی تجارت کے لیے بھی نہ صرف مسئلہ ہے بلکہ اس سے ملک میں مجموعی معیشت کا بحران پیدا ہو جاتا ہے۔

لمحۂ فکریہ ہے کہ اگر پاکستان جیسے زرعی ملک میں عام آدمی کو مناسب قیمت پر آٹا نہ ملے تو یہ صرف پیداوار کی ناکامی نہیں بلکہ پالیسی اور انتظامی ناقص منصوبہ بندی کی نشاندہی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں گندم کی سرکاری خریداری، درآمد، ذخیرہ اندوزی، کسان کو ملنے والا معاوضہ اور بازار میں آٹے کی قیمت بار بار متنازعہ دکھائی دی، جس سے کسان اور صارف دونوں پریشان رہے۔ کسانوں کو شکایت ہے کہ انہیں ان کی محنت کے مطابق فصل کا مناسب معاوضہ نہیں ملتا، دوسری جانب عام آدمی مہنگا آٹا خریدنے پر مجبور رہا، جس کا مطلب ہے کہ نظام میں تبدیلی وقت کی ضرورت ہے، کیونکہ کسان ہی نہیں، صارف بھی مطمئن نہیں۔

مہنگائی ایک ایسا جن ہے کہ جس نے چند برسوں میں پاکستانی خاندانوں کی قوتِ خرید چھین لی ہے، کیونکہ مہنگائی میں اضافہ تو ہوا لیکن کسی کے ذرائع آمدن نہیں بڑھ سکے۔ حالانکہ مہنگائی کی شرح مختلف ادوار میں کم اور زیادہ ہوتی رہی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قیمتوں میں اضافے کا اثر کبھی بھی فوری طور پر ختم نہیں ہوتا۔ ویسے بھی مہنگائی میں کمی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اشیائے ضروریہ اپنی پرانی قیمتوں پر آ گئی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قیمتوں میں اضافے کی رفتار میں کچھ کمی ہوئی ہے۔

یہ بڑی دلچسپ صورتِ حال ہے، کیونکہ یہ فرق عام آدمی کے لیے بہت اہم ہے۔ اگر کسی چیز کی قیمت چند برسوں میں دگنی ہوگئی اور اس میں پھر

معمولی اضافہ ہو تو سرکاری اعداد و شمار میں مہنگائی کم نظر آتی ہے، حالانکہ عام خاندان پر پچھلے اضافے کا بوجھ جوں کا توں ہی رہتا ہے۔ اس لیے معاشی بحالی کا اصل پیمانہ صرف افراطِ زر کی شرح نہیں، بلکہ لوگوں کی حقیقی آمدنی اور قوتِ خرید ہونی چاہیے۔

پاکستان اور اس کی حکومتوں کے لیے ایک بڑی مشکل قرضوں اور مالی خسارے کا دباؤ ہے، جس کے باعث ہر سال ٹیکس آمدن بڑھانے، توانائی نقصانات میں کمی اور عالمی مالیاتی اداروں سے کیے گئے وعدے پورے کرنے کے لیے سخت اور غیر معمولی فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن ان فیصلوں کا بوجھ تنخواہ دار طبقے، چھوٹے کاروباری اداروں اور پہلے سے مہنگائی برداشت کرنے والے صارفین پر پڑے تو معاشی استحکام کی بجائے سماجی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

لہٰذا پاکستان کو اس معاشی بحران کے خاتمے کے لیے ''وقتی ریلیف'' کی بجائے مستقل اور جامع اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ایسی پالیسی اور منصوبہ بندی کی جائے کہ بجلی کی چوری میں کمی کے ساتھ سپلائی کے نقصانات میں بھی نہ صرف کمی ہو بلکہ قابلِ تجدید توانائی میں سرمایہ کاری کے مواقع پیدا ہوں، تاکہ تیل پر انحصار آہستہ آہستہ کم کیا جا سکے۔ اسی طرح زراعت کی ترقی اور کسانوں کی خوشحالی کے لیے پانی کے ذخائر میں اضافہ اور آب پاشی نظام کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ زرعی پیداوار میں گندم اور بنیادی فصلوں کے لیے شفاف پالیسی تشکیل دینا ہوگی، تاکہ ذخیرہ اندوزوں اور مصنوعی قلت پیدا کرنے والوں کے خلاف مؤثر کارروائی کر کے حقیقی کاشتکاروں کی سہولت کاری کے لیے ان کا

جائز محنتانہ ادا کیا جا سکے۔

حکومت اور پالیسی ساز ذمہ داروں کو یہ احساس بھی کرنا ہوگا کہ معاشی پالیسی صرف اعداد و شمار میں بہتر دکھائی نہ دے، بلکہ اس سے زرِ مبادلہ کے ذخائر میں بہتری آئے، مالی خسارے میں کمی ہو اور مہنگائی کی شرح نیچے آئے، تاکہ ایک عام متوسط گھرانہ بجلی کا بل اور بچوں کے تعلیمی اخراجات کی ادائیگی کے بعد مناسب راشن خریدنے کے قابل ہو سکے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو حکمران سمجھ لیں کہ ابھی معاشی بحران کا خاتمہ ممکن نہیں ہو سکا۔

ہمیں جاننے کی ضرورت ہے کہ معیشت، توانائی، پانی اور خوراک کے بحران الگ الگ ہرگز نہیں، یہ سب ایک دوسرے سے نتھی ہیں۔ اس لیے مشترکہ اور جامع منصوبہ بندی بنائی جائے جو وقتی ہرگز نہ ہو۔ سستا اور قابلِ اعتماد ایندھن ہی زراعت اور صنعت کو مستحکم کرے گا، پانی کے بہتر انتظامات سے خوراک کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے، اسی طرح مؤثر زرعی نظام ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔

اگر ذمہ داران مشترکہ حکمتِ عملی سے غیر معمولی حالات میں غیر معمولی پالیسی تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائیں تو مہنگائی اور عام آدمی کے معاشی بوجھ کو کم کرنے میں کامیابی ضرور ملے گی۔ ہمیں ہر سال کسی بھی معاشی ''ریلیف پیکج'' کی تلاش سے باہر نکل کر مستقل ایسے انتظامات کرنے ہوں گے جس سے معاشی بحران کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کیا جا سکے۔ سخت اور غیر معمولی فیصلے ابتدائی طور پر قابلِ ہضم نہیں ہوتے، لیکن ان کے نتائج ایسے ضرور نکلتے ہیں کہ ہر کوئی مطمئن ہو جاتا ہے۔

پاکستان ترقی پذیر ملک ضرور ہے، لیکن اس کا مسئلہ مسائل سے زیادہ وسائل کا مؤثر استعمال ہے۔ ہمارے ہاں نہ باصلاحیت لوگوں کی کمی ہے اور نہ ہی جذبۂ حب الوطنی میں کوئی خامی ہے۔ تمام موسم، معدنیات اور قدرتی ذخائر بھی موجود ہیں۔ سورج کی روشنی، دریاؤں کا نظام، وسیع زرعی رقبہ، نوجوانوں کی بڑی افرادی قوت اور بڑی مقامی منڈیاں پاکستان کی طاقت ہیں۔

ضرورت صرف ایسی جامع اور طویل المدتی پالیسی کی ہے جسے منتخب ایوانوں کی ایسی حمایت حاصل ہو کہ اسے کوئی نئی حکومت من مرضی سے تبدیل نہ کر سکے، یعنی ''قومی معاشی پالیسی''، پر مصلحت پسندی کا وار کسی بھی صورت نہ چل سکے۔ اگر ایسا اجتماعی مفاد میں کر لیا گیا تو پاکستان کی معیشت، توانائی کا بحران نہ صرف ختم ہو جائے گا بلکہ تیل، پانی، آٹا اور مہنگائی کے بڑھتے مسائل پر بھی قابو پا لیا جائے گا۔

یومِ سیاہ کشمیر
پاکستان کی آواز، کشمیریوں کا عزم

ڈاکٹر محمد گلزار

(ایسوسی ایٹ پروفیسر و ڈائریکٹر اسکول آف کامرس اینڈ اکاؤنٹنسی یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی (UMT)، لاہور)

ہر سال 27 اکتوبر کو پاکستان اور دنیا بھر میں بسنے والے کشمیری یومِ سیاہ مناتے ہیں۔ یہ دن کسی ایک واقعے کی یاد نہیں بلکہ ایک ایسے سلسلے کی علامت ہے جو 1947 کی خزاں میں شروع ہوا اور آج تک ختم نہیں ہو سکا۔ اس روز بھارتی فوج جموں و کشمیر کی سرزمین پر اتری، اور اس کے بعد سے ایک پورے خطے کے لوگ اپنے حقِ خودارادیت کے انتظار میں ہیں۔ اسی تاریخی موڑ کو کشمیری اور پاکستانی اپنے اجتماعی حافظے میں "سیاہ دن" کے طور پر یاد رکھتے ہیں۔

تاریخی پس منظر: تقسیمِ ہند اور ریاستِ جموں و کشمیر

1947 میں برطانوی راج کے خاتمے پر برصغیر دو آزاد ملکوں، بھارت اور پاکستان، میں تقسیم ہوا۔ اس تقسیم کے ساتھ ساڑھے پانچ سو سے زائد دیسی ریاستوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ جغرافیائی قربت اور آبادی کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی ایک ملک سے الحاق کریں۔ ریاستِ جموں و کشمیر رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ایک بڑی ریاست تھی۔ وہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی، جبکہ حکمران مہاراجہ ہری سنگھ ہندو ڈوگرہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ریاست کی سرحدیں پاکستان سے جغرافیائی طور پر جڑی ہوئی تھیں۔ اس کے دریا، جن میں جہلم، چناب اور سندھ شامل ہیں، پاکستان کی طرف بہتے تھے۔ اس کے تجارتی راستے، ڈاک کا نظام اور معاشی روابط بھی بڑی حد تک موجودہ پاکستانی علاقوں سے وابستہ تھے۔ اگست 1947 میں مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ "اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ" کیا، یعنی موجودہ انتظامات کو برقرار رکھنے کا معاہدہ۔ بھارت نے ایسا معاہدہ نہیں کیا۔ اس دوران ریاست کے اندر بے چینی بڑھتی گئی۔ پونچھ اور دیگر علاقوں میں ڈوگرہ حکومت کے خلاف عوامی تحریک اٹھی۔ مہاراجہ کی

پالیسیوں، بھاری ٹیکسوں اور مسلم آبادی کے ساتھ امتیازی سلوک نے عوامی غصے کو ہوا دی۔ اکتوبر 1947 میں قبائلی لشکروں اور مقامی مجاہدین کی کارروائیاں بھی شروع ہوئیں، جن کے بعد مہاراجہ سری نگر سے جموں منتقل ہو گئے۔

27 اکتوبر 1947: وہ دن جو تاریخ کا موڑ بنا

اسی پس منظر میں مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت سے فوجی مدد طلب کی۔ بھارتی مؤقف کے مطابق مہاراجہ نے الحاق کی دستاویز پر دستخط کیے اور اسی بنیاد پر 27 اکتوبر 1947 کی صبح بھارتی فوج کے دستے ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر پہنچے۔ اس دن نے ریاست کی تقدیر بدل دی۔ اس الحاق کی حیثیت شروع سے متنازع رہی ہے۔ پاکستان اور کشمیری قیادت کا مؤقف ہے کہ یہ الحاق ایک ایسے حکمران نے کیا جو اپنی ہی رعایا کی حمایت کھو چکا تھا اور جو حالات کے دباؤ میں فیصلہ کر رہا تھا۔ مؤرخین میں دستاویز کی تاریخ، اس پر دستخط کے وقت اور اس کے مکمل حالات پر بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے الحاق کو قبول کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا کہ ریاست کے الحاق کا حتمی فیصلہ اس کے عوام کی رائے معلوم کر کے کیا جائے گا۔ بھارتی وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو نے بھی متعدد مواقع پر، بشمول ریڈیو اور پارلیمان میں، اس بات کا اعلان کیا کہ کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ یہی وعدہ اس تنازعے کا مرکزی نکتہ ہے۔ کشمیری اور پاکستان آج بھی اسی وعدے کی تکمیل کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اقوامِ متحدہ اور استصوابِ رائے کا وعدہ

جب معاملہ اقوامِ متحدہ تک پہنچا تو سلامتی کونسل نے اسے ایک تصفیہ طلب تنازعہ تسلیم کیا۔ 1948 میں منظور ہونے والی قرارداد نمبر 47 اور اقوامِ متحدہ کمیشن برائے بھارت و پاکستان (یو این سی آئی پی) کی قراردادوں میں، بالخصوص 13 اگست 1948 اور 5 جنوری 1949 کی قراردادوں میں، یہ اصول طے پایا کہ جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں آزادانہ اور غیر جانب دارانہ استصوابِ رائے کے ذریعے ہوگا۔ یکم جنوری 1949 کو جنگ بندی ہوئی اور ریاست عملاً دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ بھارت کے زیرِ انتظام رہا اور دوسرا پاکستان کے زیرِ انتظام۔ جنگ بندی لائن بعد میں لائن آف کنٹرول کہلائی۔ لیکن استصوابِ رائے، جس کا وعدہ تسلیم کیا گیا تھا، آج تک نہیں ہو سکا۔ سات دہائیوں سے زیادہ گزرنے کے باوجود یہ قراردادیں اقوامِ متحدہ کے ریکارڈ پر موجود ہیں اور کشمیر آج بھی سلامتی کونسل کے ایجنڈے پر ایک حل طلب مسئلہ ہے۔

کشمیریوں کی جدوجہد: نسل در نسل عزم

یومِ سیاہ کا ذکر کشمیریوں کے عزم کے بغیر ادھورا ہے۔ گزشتہ عشروں میں کشمیری عوام نے مختلف صورتوں میں اپنے حقِ خودارادیت کا مطالبہ جاری رکھا۔ کبھی سیاسی جماعتوں کے ذریعے، کبھی عوامی احتجاج کے ذریعے، اور کبھی مسلح جدوجہد کی صورت میں۔ 1980 کی دہائی کے

اواخر سے وادی میں بڑے پیمانے پر عوامی تحریک اٹھی۔اس کے بعد سے وہاں بڑی تعداد میں فوجی تعیناتی رہی ہے،اور کشمیر کو دنیا کے سب سے زیادہ عسکری موجودگی والے علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔انسانی حقوق کی تنظیموں اور اقوامِ متحدہ کے ادارے برائے انسانی حقوق نے 2018 اور 2019 کی رپورٹوں میں کشمیر کی صورتحال پر تشویش کا اظہار کیا۔ان رپورٹوں میں پیلٹ گنوں کے استعمال، گرفتاریوں، جبری گمشدگیوں، آزادیِ اظہار پر پابندیوں اور "آرمڈ فورسز اسپیشل پاورز ایکٹ" جیسے قوانین کے تحت حاصل استثنا کا ذکر ہوا۔کشمیری خاندانوں کی ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی منتظر ہے جو گمشدہ ہو گئے،اور "آدھی بیوائیں" کہلانے والی خواتین اس درد کی زندہ علامت بن چکی ہیں۔

2016 میں نوجوان رہنما برہان وانی کی ہلاکت کے بعد عوامی احتجاج کی نئی لہر اٹھی۔اس سے واضح ہوا کہ نئی نسل بھی، جس نے 1947 کو نہیں دیکھا، اپنی شناخت اور حقوق کے سوال سے دستبردار نہیں ہوئی۔سید علی گیلانی جیسے بزرگ رہنما ساری عمر حقِ خودارادیت کی بات کرتے رہے۔وہ یکم ستمبر 2021 کو طویل نظر بندی کی حالت میں وفات پا گئے۔ان کی وفات کو کشمیر کی تحریک کی ایک پوری تاریخ کا اختتام بھی سمجھا گیا۔حریت رہنما یاسین ملک کو 2022 میں دہلی کی ایک عدالت نے عمر قید کی سزا سنائی، جسے کشمیری حلقے سیاسی مقدمے کے طور پر دیکھتے ہیں۔

5 اگست 2019: ایک اور کاری ضرب

27 اکتوبر 1947 اگر اس تنازعے کا نقطہ آغاز ہے تو 5 اگست 2019 اس کی تاریخ کا ایک اور فیصلہ کن موڑ ہے۔اس دن بھارتی

حکومت نے آئین کے آرٹیکل 370 کو غیر مؤثر کر دیا، جو جموں و کشمیر کو خصوصی حیثیت دیتا تھا، اور ریاست کو دو مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وادی میں طویل کرفیو نافذ ہوا، مواصلاتی رابطے منقطع کر دیے گئے، اور سیاسی رہنماؤں کی بڑی تعداد کو حراست میں لے لیا گیا۔

پاکستان اور کشمیری حلقوں نے اس اقدام کو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کی صریح خلاف ورزی قرار دیا۔ ان کے نزدیک اس کا مقصد علاقے کی آبادیاتی ساخت کو بدلنا ہے، کیونکہ بعد میں رہائشی قوانین میں تبدیلیاں کی گئیں جن کے تحت غیر مقامی افراد کے لیے ڈومیسائل کا حصول ممکن بنایا گیا۔ پاکستان ہر سال 5 اگست کو "یومِ استحصالِ کشمیر" مناتا ہے۔ اس طرح دو تاریخیں، 27 اکتوبر اور 5 اگست، کشمیری جدوجہد کی یاد دہانی کے طور پر ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

بھارت کا سرکاری مؤقف اس کے برعکس ہے۔ وہ جموں و کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دیتا ہے، اس اقدام کو اپنا داخلی معاملہ کہتا ہے اور اسے ترقی اور انضمام کی جانب قدم بتاتا ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ نے دسمبر 2023 میں آرٹیکل 370 کی تنسیخ کو آئینی طور پر برقرار رکھا۔ تاہم پاکستان اور کشمیری قیادت اس بحث کو بھارتی آئین کے دائرے میں محدود نہیں سمجھتی، کیونکہ ان کے نزدیک یہ ایک بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ متنازع خطہ ہے جس کا حل عالمی قراردادوں میں طے ہے۔

پاکستان کی آواز: سفارتی، سیاسی اور اخلاقی حمایت

پاکستان کے لیے کشمیر محض سرحدی تنازعہ نہیں بلکہ قومی نظریے، تاریخی وابستگی اور اصولی مؤقف کا مسئلہ ہے۔ بانی؟ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے کشمیر کو پاکستان کی "شہ رگ" قرار دیا تھا، اور یہ تعبیر آج بھی پاکستانی قومی بیانیے کا حصہ ہے۔ آئینِ پاکستان اور ریاستی پالیسی، دونوں میں کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کی حمایت ایک مستقل اصول کے طور پر شامل ہے۔

پاکستان اس مسئلے کو کئی سطحوں پر اٹھاتا رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل میں، اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کے فورم پر، اور دنیا کے مختلف دارالحکومتوں میں پاکستانی سفارت کار کشمیر کا مقدمہ پیش کرتے ہیں۔ ہر سال 5 فروری کو یومِ یکجہتی کشمیر منایا جاتا ہے، جب پورے ملک میں انسانی زنجیریں بنتی ہیں، ریلیاں نکلتی ہیں اور خصوصی پروگرام ہوتے ہیں۔ یومِ سیاہ پر بھی ملک بھر میں سیاہ پرچم لہرائے جاتے ہیں، جلسے اور سیمینار ہوتے ہیں، اور کشمیری شہداء کی یاد میں خصوصی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ آزاد جموں و کشمیر میں یہ دن خاص جذبے سے منایا جاتا ہے۔

پاکستان کا مؤقف ہے کہ کشمیر کا حل صرف پرامن اور قانونی راستے سے ممکن ہے، یعنی اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق استصوابِ رائے اور بھارت و پاکستان کے مابین بامعنی مذاکرات۔ اسلام آباد بار بار عالمی برادری سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کشمیر میں انسانی حقوق کی

صورتحال کا نوٹس لے اور اپنے کردار کو فعال بنائے۔ ساتھ ہی یہ سوال بھی اہم ہے کہ سفارتی آواز کو مؤثر بنانے کے لیے مسلسل تیاری، تحقیق پر مبنی موقف اور عالمی میڈیا میں مضبوط موجودگی کیسے یقینی بنائی جائے۔ یہ خود احتسابی بھی اس دن کے تقاضوں میں شامل ہے۔

عالمی برادری اور تنازعے کی نزاکت

کشمیر کا مسئلہ صرف دو ملکوں کا نہیں بلکہ پورے جنوبی ایشیا کے امن سے جڑا ہے۔ بھارت اور پاکستان دونوں ایٹمی طاقتیں ہیں، اور اس تنازعے کی وجہ سے ان کے درمیان متعدد جنگیں اور کئی بحرانی مواقع آ چکے ہیں۔ 1965 کی جنگ، 1999 کا کارگل تنازعہ، اور 2019 اور 2025 میں سرحدی کشیدگی کے واقعات اس بات کی یاد دلاتے ہیں کہ حل نہ ہونے والا تنازعہ کسی بھی وقت خطرناک رخ اختیار کر سکتا ہے۔

بین الاقوامی برادری میں کشمیر پر بحث اکثر اقتصادی اور جغرافیائی مفادات سے متاثر رہتی ہے۔ بڑی طاقتیں بھارت کی منڈی اور اس کی اسٹریٹجک اہمیت کو پیشِ نظر رکھتی ہیں، جس کی وجہ سے انسانی حقوق کے سوالات بعض اوقات پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ تاہم انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں، پارلیمانی گروپوں، صحافیوں اور اہلِ علم کی ایک بڑی تعداد وقتاً فوقتاً اس مسئلے کو اجاگر کرتی رہی ہے۔ ان کی آوازیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ صرف جذباتی نعرہ نہیں بلکہ عالمی ضمیر کا امتحان ہے۔

شہداء، خاندان اور کشمیری معاشرہ

سیاسی اور قانونی بحثوں کے پیچھے وہ انسانی کہانیاں ہیں جو اس مسئلے کی اصل قیمت بیان کرتی ہیں۔ کوئی ماں ہے جو اپنے لاپتہ بیٹے کی

تصویر ہاتھ میں لیے برسوں سے دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ کوئی نوجوان ہے جس کی تعلیم بار بار کے کرفیو اور انٹرنیٹ کی بندش سے متاثر ہوئی۔ کوئی صحافی ہے جو پابندیوں کے باوجود سچ لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان تمام کرداروں کی مشترکہ خواہش وقار، تحفظ اور اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلے کا حق ہے۔

کشمیری ثقافت، زبان، ادب اور صوفیانہ روایت ایک بھرپور ورثہ ہے۔ شیخ نورالدین ولی، لل دید اور دیگر بزرگوں کی وراثت اس خطے کی روحانی گہرائی کی گواہ ہے۔ تحریکِ آزادی نے اس ثقافتی شناخت کو مزید مضبوط کیا ہے، کیونکہ جب کسی قوم کو اپنی پہچان کے خطرے کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنی جڑوں سے اور زیادہ مضبوطی سے جڑ جاتی ہے۔ شاعری، نوحے، کہانیاں اور فنونِ لطیفہ کشمیری مزاحمت کا اہم حصہ بن گئے ہیں۔

یومِ سیاہ کا پیغام اور آگے کا راستہ

یومِ سیاہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ کچھ وعدے وقت گزرنے سے ختم نہیں ہوتے۔ 1947 میں کیا گیا استصوابِ رائے کا وعدہ اور اقوامِ متحدہ کی قراردادیں آج بھی اپنی اخلاقی اور قانونی حیثیت رکھتی ہیں۔ کشمیریوں کا عزم اس بات کا اعلان ہے کہ تاریخ کے زخم بھلائے نہیں جاتے، اور کسی قوم کی امنگوں کو طاقت کے ذریعے مستقل طور پر دبایا نہیں جا سکتا۔

اس مسئلے کے حل کے لیے چند بنیادی نکات پر غور ضروری ہے:

اول، بھارت اور پاکستان کے درمیان بامعنی اور بلاشرط مذاکرات کا آغاز، جس میں کشمیری قیادت کو نمائندگی کا حق ملے، کیونکہ فیصلہ ان کے

مستقبل کا ہے۔

دوم، کشمیر میں انسانی حقوق کی صورتحال کی آزادانہ بین الاقوامی نگرانی، اور اقوامِ متحدہ کے مبصرین اور آزاد صحافیوں کو رسائی۔

سوم، سیاسی قیدیوں کی رہائی، مواصلاتی پابندیوں کا خاتمہ اور آزادی اظہار کی بحالی۔

چہارم، عالمی برادری کی جانب سے اصولی موقف کہ مسائل کا حل طاقت سے نہیں بلکہ قانون اور عوامی رائے کے احترام سے نکلتا ہے۔

پنجم، پاکستان کی جانب سے سفارتی کوششوں کا تسلسل، تحقیقی بنیادوں پر مضبوط مؤقف، اور عالمی رائے عامہ تک مؤثر رسائی۔

یومِ سیاہِ کشمیر ماتم کا دن ہی نہیں، عہد کی تجدید کا دن بھی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ابھی زندہ ہے، اس کے متاثرین آج بھی انصاف کے منتظر ہیں، اور ان کی آواز کو خاموش نہیں کیا جا سکا۔ پاکستان کے لیے یہ دن اس ذمہ داری کی یاد دہانی ہے کہ وہ کشمیریوں کے اصولی مؤقف کی سفارتی، سیاسی اور اخلاقی حمایت جاری رکھے۔ کشمیریوں کے لیے یہ دن اس یقین کی تجدید ہے کہ ان کی جدوجہد رائیگاں نہیں جائے گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن اقوام نے اپنے حق پر ثابت قدمی دکھائی، انہیں بالآخر سنا گیا۔ امید کی جانی چاہیے کہ وہ دن دور نہیں جب وادی کشمیر کے باسی اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کر سکیں گے، اور جنوبی ایشیا امن، استحکام اور باہمی احترام کی راہ پر گامزن ہوگا۔ تب تک 27 اکتوبر کا یہ سیاہ دن ہمیں یاد دلاتا رہے گا کہ انصاف میں تاخیر، انصاف سے انکار کے مترادف ہے، اور کشمیریوں کا عزم اس سچ کی سب سے مضبوط گواہی ہے۔

سانحہ پمز انتظامی اداروں کی نااہلی اور ناقص انتظامات

کنول افتخار
(مصنفہ ایک ممتاز صحافی اور کالم نگار ہیں اور اخبار میں کالم لکھتی ہیں)

کسی بھی معاشرے میں ہسپتال ایک ایسی جگہ ہوتی ہے، جہاں لوگ زندگی کی سب سے کمزور اور نازک حالت میں پہنچتے ہیں۔ وہ اپنے پیاروں کو لے کر اس یقین کے ساتھ آتے ہیں کہ یہاں انہیں تحفظ، دیکھ بھال اور امید ملے گی۔ جب اسی جگہ پر کوئی سانحہ رونما ہو جائے، تو یہ صرف ایک حادثہ نہیں رہتا بلکہ اس اعتماد پر ایک گہری ضرب ہوتی ہے جو عوام اور ریاستی اداروں کے درمیان قائم ہونا چاہیے۔ پاکستان انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز یعنی پمز محض ایک ہسپتال نہیں بلکہ ملک کے سب سے بڑے اور اہم سرکاری طبی اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں روزانہ ہزاروں مریض دور دراز علاقوں سے علاج کی امید لے کر پہنچتے ہیں۔ غریب اور متوسط طبقے کے لیے یہ ادارہ نجی ہسپتالوں کے مہنگے علاج کا واحد متبادل ہے۔ ایسے میں جب اس جیسے اہم ادارے میں انتظامی کوتاہی کی وجہ سے کوئی افسوس ناک واقعہ پیش آتا ہے تو یہ سوال فطری طور پر جنم لیتا ہے کہ کیا ریاستی سطح پر ان اداروں کی نگرانی اور حفاظتی معیار واقعی اس سطح پر موجود ہیں جن کا دعویٰ کیا جاتا ہے؟ ہسپتال کی بنیادی حیثیت ایک ایسے مقام کی ہے جہاں انسانی جان کو بچانے اور اس کے تحفظ کو یقینی بنانے کا کام ہوتا ہے۔ جو مریض یہاں آتا ہے وہ پہلے ہی جسمانی تکلیف، ذہنی دباؤ اور بے بسی کی کیفیت سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والے اہلِ خانہ بھی شدید نفسیاتی دباؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسے حساس ماحول میں اگر انتظامی غفلت کسی جانی نقصان یا کسی بڑے حادثے کا سبب بنے تو یہ محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ریاستی ذمہ داری میں ایک واضح خلا کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہسپتال کا مطلب صرف ڈاکٹر، نرسیں اور طبی آلات ہیں، لیکن حقیقت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ کسی بھی بڑے طبی ادارے کے پیچھے ایک مکمل انتظامی ڈھانچہ کارفرما ہوتا ہے جو نظر تو نہیں آتا مگر ادارے کے مؤثر چلنے کی بنیاد ہوتا

ہے۔عمارت کی ساختی حفاظت، بجلی اور گیس کی فراہمی کا محفوظ نظام، ایمرجنسی کے لیے واضح اور کھلے راستے، فائر سیفٹی کے آلات اور ان کی بروقت جانچ، سکیورٹی کا مؤثر انتظام، مریضوں اور عملے کی نقل وحرکت کا منظم طریقہ کار، صفائی ستھرائی کے اعلیٰ معیارات، طبی آلات کی بروقت مرمت اور دیکھ بھال، اور ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے باقاعدہ مشقیں، یہ سب امورِ انتظامیہ کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک پہلو میں بھی کوتاہی برتی جائے تو نتائج انتہائی سنگین ہو سکتے ہیں۔

پاکستان میں المیہ یہ ہے کہ کسی بھی افسوس ناک واقعے کے بعد ابتدائی چند دنوں میں شدید ردِعمل سامنے آتا ہے۔ ٹی وی چینلز پر بحثیں ہوتی ہیں، حکومتی سطح پر نوٹس لیے جاتے ہیں، تحقیقاتی کمیٹیاں تشکیل دی جاتی ہیں اور ذمہ داروں کے تعین کی بات کی جاتی ہے۔ مگر چند ہفتوں بعد یہ سارا معاملہ خبروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ عوامی توجہ کسی نئے موضوع کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور نظام اسی ڈھب پر واپس چلنے لگتا ہے جس نے پہلے سانحے کو جنم دیا تھا۔ یہی وہ روایتی طرزِ عمل ہے جسے اب تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اگر کسی سانحے میں انتظامی کوتاہی ثابت ہو جائے تو یہ ہرگز مناسب نہیں کہ ذمہ داری کا تمام بوجھ کسی ایک نچلے درجے کے ملازم یا اہلکار پر ڈال کر معاملہ ختم کر دیا جائے۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف غیر منصفانہ ہے بلکہ اصل مسئلے کی جڑ تک پہنچنے میں بھی رکاوٹ بنتا ہے۔ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ نگرانی کا مجموعی نظام کہاں ناکام ہوا۔ کیا خطرے کی نشاندہی وقت پر ہوئی تھی اور اگر ہوئی تھی تو اس پر عمل درآمد کیوں نہیں کیا گیا؟ کیا متعلقہ افسران کو اس صورتحال کا علم تھا؟ کیا وسائل کی کمی کا بروقت ازالہ کرنے کے لیے کوئی درخواست دی گئی تھی، اگر دی گئی تھی تو اس پر کیا کارروائی ہوئی؟ یہ تمام سوالات اس وقت تک حل طلب رہیں گے جب تک ایک مکمل اور شفاف تحقیقات نہ کی جائے۔ اس تناظر میں ایک اور اہم سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سرکاری ہسپتالوں میں حفاظتی معائنوں کا نظام حقیقت میں کتنا مؤثر ہے۔ کیا فائر سیفٹی کے آلات، ایمرجنسی الارمز اور دیگر حفاظتی انتظامات صرف کاغذی کارروائی اور فائلوں کی حد تک محدود ہیں، یا ان کی عملی جانچ بھی وقتاً فوقتاً کی جاتی ہے؟ کیا ہنگامی صورتحال پیش آنے پر عملہ فوری اور مؤثر ردِعمل دینے کے لیے تربیت یافتہ ہوتا ہے؟ کیا مریضوں اور ان کے لواحقین کو ہنگامی حالات میں نکلنے کے راستوں اور حفاظتی تدابیر سے متعلق مناسب معلومات فراہم کی جاتی ہیں؟ اگر ان سوالات کے جوابات تسلی بخش نہیں تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ ایسے واقعات دوبارہ رونما ہونے کا خطرہ کیوں برقرار رہتا ہے۔ یہ مسائل صرف پمز تک محدود نہیں بلکہ ملک بھر کے بڑے سرکاری ہسپتالوں میں کم و بیش یکساں نوعیت کے چیلنجز موجود ہیں۔ مریضوں کا غیر معمولی دباؤ، محدود مالی وسائل، پرانی اور فرسودہ عمارتیں، پیچیدہ انتظامی ڈھانچہ اور بعض اوقات تربیت یافتہ عملے کی کمی، یہ سب ایسے عوامل ہیں جو کسی بھی وقت کسی سانحے کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔

تاہم یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ وسائل کی کمی کبھی بھی بنیادی حفاظتی ذمہ داریوں میں غفلت کا جواز نہیں بن سکتی۔ جہاں انسانی جانوں کا معاملہ ہو، وہاں معمولی سی کوتاہی بھی نہایت سنگین اور ناقابلِ تلافی نقصان میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس صورتحال کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی

سانحے کے رونما ہونے کے بعد محض رسمی اور روایتی طرز کی تحقیقات پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ایک مکمل طور پر آزاد اور شفاف انکوائری کا اہتمام کیا جائے۔ اس انکوائری میں واقعے کی حقیقی وجوہات کو سامنے لایا جانا چاہیے، انتظامی کمزوریوں کی واضح نشاندہی کی جانی چاہیے، مستقبل میں ایسے واقعات کے تدارک کے لیے عملی اور قابلِ اطلاق اقدامات تجویز کیے جانے چاہئیں۔ اگر تحقیقات کے دوران کسی افسر یا اہلکار کی غفلت یا کوتاہی ثابت ہوتی ہے تو اس کے خلاف قانون اور مقررہ ضوابط کے مطابق سخت کارروائی عمل میں لائی جانی چاہیے، تاکہ ایک واضح پیغام جائے کہ انسانی جان سے متعلق معاملات میں کسی بھی قسم کی غفلت قابلِ قبول نہیں۔ اس کے علاوہ ہسپتال انتظامیہ کو محض حادثات کے رونما ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے پیشگی حفاظتی نظام کو مضبوط بنانا ہوگا۔ ہر بڑے سرکاری ہسپتال میں باقاعدگی سے سیفٹی آڈٹ کروانا، ہنگامی حالات سے نمٹنے کی مشقیں منعقد کرنا، فائر سیفٹی کے آلات کی مسلسل جانچ، طبی آلات کی بروقت مرمت اور دیکھ بھال، اور خطرناک مقامات کی مستقل نگرانی از حد ضروری امور ہیں۔ ادارے کی کارکردگی کا جائزہ لیتے وقت صرف یہ نہیں دیکھا جانا چاہیے کہ کتنے مریضوں کا علاج ہوا یا مالی معاملات کس حد تک شفاف رہے، بلکہ یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ مریضوں اور عملے کی حفاظت کے حوالے سے ادارے نے کیا اقدامات کیے ہیں۔

پمز کی حیثیت محض ایک عام ہسپتال کی نہیں بلکہ یہ قومی سطح کا ایک نہایت اہم طبی ادارہ ہے، جس پر لاکھوں شہریوں کا اعتماد قائم ہے۔ یہاں علاج کے لیے آنے والے مریض کسی خصوصی رعایت کے طلب گار نہیں ہوتے، وہ صرف اپنے بنیادی حق کے مطابق ایک محفوظ اور مؤثر طبی سہولت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ریاستی ہسپتال میں زیرِ علاج شہری کی جان اتنی ہی قیمتی اور محترم ہے جتنی کسی نجی اور

مہنگے ہسپتال میں علاج کروانے والے فرد کی۔ محض معاشی حیثیت کی بنیاد پر کسی کی جان کی قدر کم یا زیادہ نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی سانحے کا سب سے بڑا المیہ محض یہ نہیں ہوتا کہ ایک نقصان رونما ہو گیا، بلکہ اصل المیہ اس وقت جنم لیتا ہے جب اس واقعے سے کوئی سبق نہ سیکھا جائے اور وہی غلطیاں بار بار دہرائی جاتی رہیں۔ اگر پمز کے سانحے نے انتظامی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے تو اب اصل امتحان یہ ہے کہ متعلقہ حکومتی اور انتظامی ادارے ان خامیوں کے تدارک کے لیے کیا عملی، ٹھوس اور دیرپا اقدامات کرتے ہیں۔ محض بیانات، پریس کانفرنسز اور وقتی نوٹسز سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ تحقیقات، ذمہ داری کا واضح تعین اور اصلاحات کا مؤثر نفاذ یہ تین مراحل ہیں، جن کی تکمیل کے بغیر کسی بھی سانحے پر ظاہر کیا جانے والا افسوس محض رسمی اور نامکمل رہ جاتا ہے۔ انسانی جانوں کا تحفظ کوئی معمولی انتظامی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ ایک ریاستی امانت ہے جو عوام نے اپنے اداروں کے سپرد کی ہے۔ اس امانت میں کسی بھی نوعیت کی معمولی سی کوتاہی بھی ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بن سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے واقعات کو محض ایک خبر کے طور پر نہیں بلکہ ریاستی سطح پر ایک سنجیدہ چیلنج کے طور پر لیا جانا چاہیے۔ اگر آج اس سانحے سے سبق نہ سیکھا گیا تو مستقبل میں کسی نہ کسی صورت میں یہ کوتاہیاں دوبارہ کسی نئے سانحے کی صورت میں سامنے آ سکتی ہیں، تب شاید معاملہ اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین ہو۔

کرکٹ بحران
مسلسل شکستیں اور تبدیلیاں

ناصر نقوی
(مصنف سینئر جرنلسٹ اور کالم نویس ہیں)

ماضی کی طرح پاکستان کرکٹ ٹیم ایک مرتبہ پھر گمبھیر بحران میں پھنس گئی ہے۔ مسلسل شکستوں کے باعث کھلاڑی ہی نہیں، سلیکٹرز، کوچ، کرکٹ بورڈ سخت تنقید کا نشانہ بنا ہوا ہے، کیونکہ کرکٹ پاکستان میں صرف کھیل نہیں، قومی جذبات کا حصہ بن چکی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب جب قومی ٹیم نے فتح حاصل کی، قوم نے پورے ملک میں جشن منایا۔ ہار جیت ہر کھیل کا نمایاں حصہ ہوتی ہے، لیکن جب قومی ٹیم کے ذمہ داردعووں کے باوجود بہتر کارکردگی نہیں دکھاسکیں اور مایوس کن کھیل کا مظاہرہ کریں، ہر مرتبہ ایک جیسی غلطیاں دہرائیں اور شکست در شکست مقدر بن جائے تو پھر سوال تو اٹھیں گے، تنقید بھی ہوگی اور یہ سب کچھ صرف کھلاڑیوں تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ کرکٹ بورڈ، سلیکٹر، سلیکشن کے طریقہ کار، کوچز اور مجموعی حکمت عملی کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے گا۔

گزشتہ چند سالوں میں پاکستانی کرکٹ غیر یقینی صورتِ حال سے گزری، لہٰذا سوال یہ پیدا ہوگیا کہ حقیقی بحران میدان میں ہے کہ میدان سے باہر؟ حالانکہ پاکستان میں باصلاحیت کھلاڑیوں کی کمی نہیں، پھر بھی اگر گزشتہ چند سالوں کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو ہنگامہ خیزی دکھائی دے گی۔ 2024 کے ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ میں قومی ٹیم پہلے مرحلے میں ہی مقابلے سے باہر ہوگئی تھی، نکہ ایک اچھی ٹیم جو ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ جیتنے گئی تھی، وہ نہ صرف امریکہ جیسی ٹیم سے شکست کھا گئی بلکہ روایتی حریف بھارت سے جیتا ہوا میچ بھی ہار گئی۔ اسی طرح 2023 میں ایک روزہ ورلڈ کپ میں بھی قومی ٹیم سیمی فائنل تک نہیں پہنچ سکی تھی، جس نے یہ بتا دیا کہ صرف انفرادی صلاحیت پر انحصار عالمی کرکٹ میں کامیابی

کے لیے کافی نہیں۔

پھر یہ بات 2025 میں سامنے آئی کہ صورتِ حال مکمل طور پر مایوس کن نہیں، منصوبہ بندی اور حکمت عملی کا فقدان ہے۔ اس سال پاکستان کرکٹ ٹیم نے مختلف انداز میں 56 بین الاقوامی میچ کھیلے اور ان میں سے 30 میں کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح ٹی ٹونٹی ٹیم نے 34 میچوں میں سے 21 میچ جیتے۔ یہی نہیں، اسی ٹیم نے بنگلہ دیش، جنوبی افریقہ اور ویسٹ انڈیز کے خلاف سیریز میں بھی فتح حاصل کی، بلکہ پاکستان نے دوسہ ملکی ٹی ٹونٹی ٹورنامنٹس میں بھی کامیابی حاصل کی۔ اسی سال پاکستان نے تقریباً 30 سال بعد آئی۔ سی۔ سی چیمپئنز ٹرافی کی میزبانی بھی کی۔

2025 کے ایشیا کپ میں پاکستان فائنل میں پہنچا، لیکن فائنل میں روایتی حریف بھارت کے خلاف مضبوط آغاز کے باوجود ڈھیر ہو گیا، کیونکہ اچانک بیٹنگ لائن ریت کی دیوار کی طرح گر گئی اور بھارت پانچ وکٹوں سے فتح حاصل کر کے ایک مرتبہ پھر ایشیا ورلڈ کپ جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس شکست سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ کامیابیوں کے باوجود بھی بڑے مقابلے میں مستقل مزاجی کا فقدان برقرار رہا۔ پاک بھارت مقابلہ ہر صورت میں پاکستانی کھلاڑیوں کے لیے دباؤ کا باعث بنتا ہے۔ پاکستانی کھلاڑی اپنے پرستاروں کی خواہش پر روایتی حریف کے مدِ مقابل ہوش اور حکمت عملی کی بجائے عوامی جذبات کو مدِ نظر رکھ کر کھیلتے ہیں، لیکن ایسے میں ٹیم آفیشلز بھی کھلاڑیوں کے اعتماد کی بحالی اور اسپورٹس مین اسپرٹ پر کوئی دھیان نہیں دے پائے، ورنہ ایشیا کپ میں کھلاڑیوں کی کارکردگی یک دم زمین بوس ہر گز نہ ہوتی۔

اب اگر 2026 کو پرکھنے کی کوشش کریں تو ٹیسٹ میچوں کی صورتِ حال نے بحران کو مزید نمایاں کر دیا۔ ویسٹ انڈیز سے ایک ایک میچ سے سیریز برابر ہوئی، یہ کوئی بری کارکردگی نہیں تھی، لیکن انگلینڈ کے خلاف پاکستان کو ایک اننگز اور 103 رنز سے شکست ہوئی، جبکہ دوسرا ٹیسٹ بھی انگلینڈ نے 194 رنز سے جیت لیا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ لارڈز کے میدان میں پاکستان کو عبرت ناک شکست ہوئی، جہاں پاکستان نے ہمیشہ یادگار کرکٹ کھیلی۔ دلچسپ اور حیران کن کارکردگی یہ ہے کہ ان دونوں میچوں کی چار اننگز میں پاکستانی ٹیم 200 اسکور تک بھی نہیں پہنچ سکی، لہٰذا شائقینِ کرکٹ ضرور سوال کریں گے کہ ایسا کیوں ہوا؟

اس صورتِ حال میں بات اسکور بورڈ کی شکست سے آگے نکل گئی۔ سنگین سوالات اٹھے کہ بیٹنگ کی عدم استحکام، تکنیکی کمزوری، بیرونِ ملک مشکل حالات میں کھیلنے کی صلاحیت اور ٹیم مینجمنٹ کے فیصلے ناقص تھے۔ اس لیے پاکستان کرکٹ بورڈ نے سخت ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیسرے ٹیسٹ سے پہلے محمد رضوان، امام الحق، سلمان علی آغا، علی عثمان، عامر جمال، محمد اویس ظفر اور خرم شہزاد سمیت سات کھلاڑیوں کو ٹیسٹ اسکواڈ سے فارغ کر کے سات نئے کھلاڑی شامل کر دیے، جن میں سے پانچ کھلاڑی ایسے تھے جنھوں نے ٹیسٹ کرکٹ کھیلی ہی نہیں۔ کھلاڑیوں کے ساتھ ریڈ بال ہیڈ کوچ سرفراز احمد اور باؤلنگ کوچ عمر گل کی بھی چھٹی کرا کے مائیک ہیسن کو ٹیم کی ذمہ داری دے دی گئی، جبکہ اسٹیلے

نوفلکے کو بیک روم اسٹاف میں شامل کر دیا گیا۔ اس سے قبل اگست میں مائیکل اسمتھ کو دو سال کے لیے قومی ٹیم کا بیٹنگ کوچ مقرر کیا جا چکا تھا۔

ان تبدیلیوں سے سوالات و تنقید کا سلسلہ رو کا نہیں، بلکہ ہر کسی نے یہ تنقید کی کہ اگر اسی طرح اچانک تبدیلیوں کی روایت چل نکلی تو کھلاڑیوں کا اعتماد کیسے بحال ہوگا اور کھلاڑیوں میں ٹیم اسپرٹ کیسے پیدا کی جا سکے گی؟ کیونکہ کرکٹ کا موجودہ بحران ہو کہ مستقبل کی منصوبہ بندی بڑے پیمانے پر تبدیلیاں حقیقی مسائل کا حل نہیں ہیں۔ رائٹرز کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کرکٹ ٹیم میں چند برسوں میں کپتان، کوچ، سلیکٹر، کھلاڑیوں کی تبدیلی سے کبھی بھی مثبت نتائج نہیں نکلیں گے۔ سابق پاکستانی کوچ جیسن گلیسپی نے بھی حالیہ تبدیلیوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسلسل ردو بدل ٹیم کو استحکام اور کھلاڑیوں کو اعتماد نہیں دے گی۔ اس کا اندازہ پاکستان کی آٹھ ٹیسٹ سیریز سے لگایا جا سکتا ہے، جس میں اسے صرف ایک سیریز میں فتح نصیب ہوئی۔

لیکن پاکستان کرکٹ بورڈ کے حمایتی کہتے ہیں مسلسل ناکامی اور ناقص کارکردگی کے بعد احتساب ضروری تھا۔ اگر سینئر کھلاڑی بار بار مواقع ملنے کے باوجود اچھی کارکردگی یا مطلوبہ نتائج نہیں دیتے تو ان کی جگہ نئے باصلاحیت کھلاڑیوں کو موقع ملنا چاہیے، کیونکہ قومی ٹیم کسی کی مستقل ملکیت نہیں، یہاں معیار صرف کارکردگی ہی ہونا چاہیے۔ جبکہ اسپورٹس لورز اور سابق قومی کھلاڑیوں کی رائے ہے کہ اگر ہر شکست کے بعد کپتان کو تبدیل کر دیا جائے تو سلیکشن پالیسی بھی تبدیل ہو جائے گی۔ ایسے میں طویل المدتی منصوبہ بندی ناممکن ہو جائے گی۔

اسی طرح نئے کھلاڑیوں کی اعتماد سازی کے لیے بھی ضروری ہے کہ انہیں ایک دو نا کامیوں کے باوجود اپنی صلاحیتوں کو ثابت کرنے کے مواقع ملنے چاہییں، ورنہ نکالے جانے کے خوف میں ان کی بھرپور صلاحیتیں بھی کارگر ثابت نہیں ہوں گی۔ اسی طرح کوچز کو بھی واضح مدت، اختیار اور اہداف دیے جانے چاہییں، ورنہ قومی ٹیم کو مضبوط نہیں کیا جا سکے گا، بلکہ انفرادی مقابلے کے رجحان میں اضافہ ہوگا۔ ہر کوئی اپنی جگہ بنانے کے لیے کارکردگی دکھائے گا، مجموعی طور پر ٹیم اسپرٹ پیدا نہیں کی جا سکے گی اور اگر ٹیم اسپرٹ سے نہ کھیلا گیا تو پھر کرکٹ ''بائی چانس'' کا فارمولا ہی دکھائی دے گا۔ ہار جیت کی آنکھ مچولی قسمت سے ہی ختم ہوگی، اس لیے کہ مدِ مقابل پر فتح حاصل کرنے کے لیے ہر ٹیم کی مشترکہ حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کرکٹ کے میدان میں انفرادی کارکردگی صرف ذاتی ریکارڈ تک ہی محدود رہ جاتی ہے جیت ہمیشہ مشترکہ حکمت عملی اور اجتماعی کارکردگی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔

پاکستان میں باصلاحیت کرکٹرز کی کمی نہیں، مسئلہ ان صلاحیتوں کو عالمی معیار پر منظم کرنے کا ہے۔ ڈومیسٹک کرکٹ اور قومی کرکٹ کے درمیان واضح فرق کارکردگی اور کھیل کے حوالے سے نظر آنا چاہیے۔ کھلاڑیوں کی میرٹ پر سلیکشن، جدید کوچنگ، ذہنی اور جسمانی تربیت اور مربوط انتظامی حکمت عملی میں ٹیسٹ، ون ڈے اور ٹی ٹوئنٹی، یعنی ہر فارمیٹس کی تیاری کیونکہ کرکٹ کے ہر انداز کے تقاضے مختلف ہیں۔

حالیہ تبدیلیاں پاکستان کرکٹ کے لیے نئے دور کا آغاز بھی بن سکتی ہیں، کیونکہ اس بڑے فیصلے سے احتساب کا رواج جنم لے سکتا ہے، لیکن اس کے لیے بھی کرکٹ بورڈ کو مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرنا پڑے گا، ورنہ یہ تبدیلی بھی ماضی کی طرح عارضی تجربہ ہی قرار پائے گی۔ کیونکہ نئے کھلاڑیوں کو اپنی صلاحیتوں کے مظاہرے کے لیے وقت درکار ہوگا۔ ہر کھلاڑی دباؤ اور غیر معمولی حالات میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ ایسے میں نکالے جانے کا خوف بھی کارکردگی پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اگر چند شکستوں کے بعد پھر کوئی بڑا فیصلہ آ گیا تو پھر کرکٹ بحران خاتمے کی بجائے بڑھ جائے گا، کیونکہ ٹیمیں صرف باصلاحیت کھلاڑیوں اور کسی ایک فرد کی کامیابی سے ہرگز نہیں بنتیں، اس کے لیے مستقل منصوبہ بندی، واضح حکمت عملی، اعتماد سازی کے ساتھ احتساب اور تسلسل کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

اس صورتِ حال میں پاکستان کرکٹ بورڈ کی توجہ ہار جیت کی بجائے ایک مستقل حکمت عملی سے ڈومیسٹک کرکٹ کے باصلاحیت کھلاڑیوں کا میرٹ پر انتخاب کر کے انہیں ان کے کھیل کے مطابق ٹیسٹ، ون ڈے اور ٹی ٹوئنٹی کے حوالے سے تیار کرانے کی منصوبہ بندی کرنی ہوگی، کیونکہ ہر شکست کے بعد ٹیم، کوچز، سلیکٹرز اور کھلاڑیوں کی اکھاڑ پچھاڑ سے مثبت نتائج نہیں نکل سکتے۔ پاکستان کرکٹ کے حوالے سے انتہائی زرخیز سرزمین ہے، یہاں ٹیلنٹ کی کمی نہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی اور انہیں عالمی معیار کی کوچنگ دینے کے انتظامات کرنے ہوں گے۔ وقتی شکستوں کو بھول کر مستقبل کی فتوحات کی منصوبہ بندی ابھی بھی ممکن ہے۔

ہماری مطبوعات

نمبر شمار	مطبوعات	زبان	قیمت پاکستانی روپے	قیمت امریکی ڈالر
1	قائداعظم محمد علی جناح خطابات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (مجلد)	انگریزی	150/-	$-05
2	قائداعظم محمد علی جناح خطابات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (پیپر بیک)	انگریزی	150/-	$-05
3	قائداعظم محمد علی جناح خطابات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (پیپر بیک)	اردو	350/-	$-17
4	قائداعظم محمد علی جناح (تصویری البم) 1876ء تا 1948ء (مجلد)	انگریزی	350/-	$-17
5	قائداعظم محمد علی جناح (تصویری البم) 1876ء تا 1948ء (پیپر بیک)	انگریزی	350/-	$-17
6	قائداعظم کے سنہری اقوال	انگریزی	100/-	$-04
7	اقوال قائداعظم (پیپر بیک)	انگریزی	50/-	$-03
8	قائداعظم کے بانی محمد علی جناح	انگریزی	400/-	$-15
9	جناح اصحاب کا دور (آرٹ پیپر بک)	انگریزی	250/-	$-10
10	مادرِ ملت سیاسیات	اردو	250/-	$-10
11	مادرِ ملت تصویری البم	اردو	250/-	$-10
12	پاکستان ویژول کرافٹس	انگریزی	200/-	$-04
13	پاکستان کرونولوجی 1947ء تا 2006ء (چار جلدیں)	انگریزی	450/-	$-17
14	پاکستان کرونولوجی 1947ء تا 2006ء (پیپر بیک)(چار جلدیں)	انگریزی	400/-	$-15
15	پاکستان منظرنامے	انگریزی	250/-	
16	پاکستان بنیادی حقائق	انگریزی	50/-	$-02
17	آئینہ پاکستان ایک طائرانہ نظر	انگریزی	2000/-	$-120
18	پاکستان سرزمین نظارہ جمیل (تصاویر اور دلکش مقامات، گرافکس پیکج)	انگریزی	1000/-	$-20
19	پاکستان آئینی مسودوں کی ٹکریں (پیپر بیک ایڈیشن)	انگریزی، عربی، فرانسیسی، چینی	500/-	$-20
20	اٹلس سیریز ایوارڈز	انگریزی	2500/-	$-125
21	چھوٹوں کے کتابچے	انگریزی	60/-	
22	دلفریب گلگت	انگریزی	200/-	$-12
23	لوک آرٹ	انگریزی	200/-	$-08
24	کنٹمپریری آرٹ ان پاکستان (از اکرام الحق)	انگریزی	100/-	$-04
25	مسلم آرٹس اینڈ ہیریٹیج آف پاکستان (از ڈاکٹر اکرام الحق)	انگریزی	100/-	$-04
26	اسلامی معاشرتی اقدار	اردو	15/-	$-01
27	وحدت افکار (علامہ اقبال کی شاعری سے انتخاب)	اردو	100/-	$-04
28	رحمت کا نور (عبدالستار ایدھی)	انگریزی	615/-	$-50
29	ماہِ نو غالب (خصوصی ایڈیشن)	اردو	500/-	$-60
30	ماہِ نو اقبال (خصوصی ایڈیشن)	اردو	350/-	$-17
31	ماہِ نو قائداعظم (خصوصی ایڈیشن)	اردو	500/-	$-60
32	ماہِ نو فیض (خصوصی ایڈیشن)	اردو	500/-	$-60
33	ماہِ نو احمد فراز (خصوصی ایڈیشن)	اردو	500/-	$-60
34	ماہِ نو احمد ندیم قاسمی (خصوصی ایڈیشن)	اردو	400/-	$-60
35	ماہِ نو جالب نمبر (خصوصی ایڈیشن)	اردو	500/-	$-60
36	ماہِ نو جوش (خصوصی ایڈیشن)	اردو	400/-	$-60
37	ماہِ نو انتخاب دو سالہ (خصوصی ایڈیشن)	اردو	400/-	$-60
38	ماہِ نو انتخاب 2018 (خصوصی ایڈیشن)	اردو	400/-	$-60
39	ماہِ نو سرسید احمد خان (خصوصی ایڈیشن)	اردو	400/-	$-15
40	ماہِ نو حسرت موہانی (خصوصی ایڈیشن)	اردو	400/-	$-60
41	ماہِ نو (ماہنامہ)(گذشتہ شمارے)	اردو	100/- فی شمارہ	
42	ماہِ نو (ماہنامہ)(آن لائن)	اردو		
43	پاک جمہوریت (ہفت روزہ)(خصوصی ایڈیشن)	اردو	10/-	
44	پاک جمہوریت (ماہنامہ)(گذشتہ شمارے)	اردو	100/- فی شمارہ	
45	پاک جمہوریت (ماہنامہ)(آن لائن)	اردو		
46	پاکستان کیلنڈر	انگریزی	200/-	$-120

رابطہ برائے خریداری

منیجر: ڈائریکٹوریٹ جنرل آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز، پی۔ ایف بلڈنگ زیرو پوائنٹ، اسلام آباد، پاکستان۔ فون: 051-9252182 فیکس: 051-9252176

DIRECTORATE OF ELECTRONIC MEDIA AND PUBLICATIONS

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز، اسلام آباد

ریجنل آفس: 291اے، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور۔